بچوں کی دنیا

جلد:2 شمارہ:11 نومبر 2014

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ علی تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000

شعبۂ ادارت: 11-49539009

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

شعبۂ فروخت: فون: 26109746

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم،

نئی دہلی-110066

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 040 - 24415194

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	4
محرم	سلطان کربلا کو ہمارا سلام ہو		5
	کربلا کے بہادر بچے	عذرا نقوی	6
گرونانک جینتی	گرو کی نصیحت	محمد سراج عظیم	8
عمارتیں	دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت	سمیع الدین خاں شاداب	11
دیوالی	پٹاخوں کی کہانی	بانو سرتاج	16
یوم اطفال	پیارے چاچا (نظم)	محبوب راہی	21
خراج عقیدت	کارٹونسٹ پران	محمد مبشر نوید	22
کہانیاں	ایمانداری کا پھل	حسین الحق	24
	قیمتوں کا لباس	سید لطف اللہ	26
	بھاگ لالہ بھاگ۔۔۔	سلطان احمد اشک	29
	شیر اور پنجرہ	مظہر الاسلام علیگ	33
مزاحیہ نظم	دیکھ رہا ہوں	حشمت کمال پاشا	36
کامکس	بھولے بھالو کی حماقتیں	ادارہ	37
دنیا کی سیر	ٹیمز کے کنارے	حفیظ الرحمن انصاری	43
اردو ایس ایم ایس	یہ مزے مزے کی حکایتیں	ادارہ	47
قسط وار	فسانۂ عجائب، آخری قسط	رجب علی بیگ سرور	51
ننھے فنکار	بچوں کی تخلیقات	ادارہ	59
اردو فیس بک	بچوں کی باتیں	ادارہ	60
ڈاک خانہ	بڑوں کی باتیں	ادارہ	61

آپس کی باتیں

دوستو، پچھلے دنوں دو بڑے ہی اہم واقعات ہمارے ساتھ پیش آئے ہیں۔ ایک آسمان میں، دوسرا زمین پر۔ یہ دونوں ہی واقعے ایسے ہیں جن سے نہ صرف ہندوستان کی عزت بڑھے گی بلکہ ہم ہندوستانیوں کی عام زندگی میں بھی اچھی تبدیلیاں آئیں گی۔

پہلے آسمان کی بات کرتے ہیں۔ خلائی تحقیق کی عالمی تاریخ میں 24 ستمبر 2014 کا دن ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس روز ہمارا پیارا ملک چاند سے بھی آگے بڑھ گیا۔ ہماری خلائی ایجنسی اسرو ISRO کا پچھلے سال نو مہینے میں خلا میں بھیجا گیا مصنوعی سیارہ 'منگل یان' تقریباً 65 کروڑ کلومیٹر کا سفر طے کر کے ہمارے نظام شمسی کے سب سے پراسرار سیارے Planet مریخ یعنی Mars کے مدار میں داخل ہو گیا اور اس وقت وہ ہر 72 گھنٹے 51 منٹ میں مریخ کا ایک چکر لگا کر بے حد قیمتی معلومات اور تصویریں زمین پر ہمارے کنٹرول اسٹیشن کو بھیج رہا ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر ہم جتنا بھی فخر کریں وہ کم ہے کیونکہ اب ہندوستان دنیا کا وہ پہلا ملک بن گیا ہے جس نے مریخ تک پہنچنے کی اپنی پہلی کوشش میں ہی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ چین اور جاپان اس کوشش میں عرصے سے لگے ہوئے تھے مگر کسی نہ کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے وہ کامیاب نہیں ہو پائے۔ لیکن ہمارے ہونہار سائنسدانوں نے کسی باہر کے ملک سے کوئی مدد لیے بغیر اپنے دماغ اور خالص ہندوستانی ساز و سامان کی مدد سے 'منگل یان' کو مریخ تک پہنچا دیا جہاں اسے چھ ماہ تک اپنے مشن پر کام کرنا ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہم نے صرف 450 کروڑ روپے کی لاگت سے یہ کام پورا کیا ہے جس میں سیارے پر آنے والی لاگت بھی شامل ہے۔ اتنی رقم سے امریکہ کے ہالی وڈ میں صرف ایک بڑی فیچر فلم بن پاتی ہے۔ ہمارے وزیر اعظم نے اس کم خرچ پر ایک بڑی دل چسپ مگر بڑے کام کی بات کہی۔ ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں ٹیکسی اور آٹو سے سفر کرنے پر بھی دس روپے فی کلومیٹر کا کرایہ لگ جاتا ہے جب کہ ہم صرف سات روپے فی کلومیٹر خرچ کر کے مریخ تک پہنچ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہم آگے چل کر اور بھی کم لاگت سے بڑے بڑے خلائی کام انجام دے سکتے ہیں۔

اب آئیے زمین کی طرف۔ 'منگل یان' کی کامیابی کے بعد وزیر اعظم کے خاص منصوبے کے تحت مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش 2 اکتوبر کو وزیر اعظم کی قیادت میں 'صاف ستھرا ہندوستان مشن' کا آغاز ہوا۔ انھوں نے بذات خود اس مہم میں حصہ لے کر قوم کو صفائی ستھرائی کا حلف دلایا اور اس بات پر زور دیا کہ جب تک ہم ہندوستان کی سرزمین کو کوڑے کچرے سے پاک نہیں کر لیں گے اور اسے ایک صاف ستھرا ملک نہیں بنائیں گے تب تک ہماری ہر طرح کی ترقی بے معنی ہے۔ ایسا نہیں کہ گلی کوچوں، اسکولوں سڑکوں اور عمارتوں میں صفائی کرنے کی مہم اس سے پہلے کبھی نہیں چلائی گئی۔ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ لیکن یہ پہلا موقع ہے جب اسے پورے ملک نے ایک مشن کے طور پر اپنایا ہے اور عہد کیا ہے کہ 2019 میں ڈیڑھ سو ویں گاندھی جینتی پر ہم بابائے قوم کو ایک صاف ستھرے ہندوستان کی صورت میں عقیدت پیش کریں گے۔ پوری قوم نے یہ حلف لیا کہ ہر شخص ایک سال میں کم سے کم ایک سو گھنٹے اپنے کام کرنے کی جگہوں اور ان کے آس پاس کے علاقے کو صاف ستھرا رکھنے کے کاموں میں لگائے گا۔ پیارے دوستو، جس طرح ہم خود صاف ستھرے رہتے ہیں، اپنی سبھی چیزوں کو صاف رکھتے ہیں اسی طرح ہم اپنے گھروں میں اور باہر گلیوں اور سڑکوں پر بھی سب کچھ صاف ستھرا رکھیں تو اس سے نہ صرف ہم، بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہیں گے بلکہ ایک صاف ستھرے ماحول میں جینے کا صحیح لطف بھی اٹھا سکتے ہیں۔ دنیا کا ہر مذہب صاف ستھرا رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ دنیا کی تمام بڑی تہذیبیں اسی لیے بڑی بن سکی ہیں کہ انھوں نے صفائی ستھرائی اور قرینے و سلیقے کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا تھا۔ ہم بھی صاف ستھرا طرز زندگی اپنائیں۔ کوئی بھی گندی چیز یہاں وہاں پھینکنے کے بجائے اسے کوڑے دان میں ڈالیں اور ڈسٹ بن Dustbin کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس کے استعمال کو اپنی عادتوں کا حصہ بنا لیں تو یہ صرف ملک و قوم کی خدمت نہیں ہوگی بلکہ اس طرح ہم خود اپنی زندگی کو بھی اچھا بنا سکیں گے۔ کام یہ معمولی سہی لیکن اس کے فائدے بے شمار ہیں۔ امید ہے آپ بھی اس کا پورا خیال رکھیں گے!

آپ کا خواجہ محمد اکرام الدین

یا حسین

سلطانِ کربلا کو ہمارا سلام ہو

سلطانِ کربلا کو ہمارا سلام ہو
جانانِ مصطفیٰؐ کو ہمارا سلام ہو

عباسؓ نامدار ہیں زخموں سے چور چور
اس پیکرِ رضا کو ہمارا سلام ہو

اکبر سے نوجوان بھی رن میں ہوئے شہید
ہم شکلِ مصطفیٰؐ کو ہمارا سلام ہو

بھائی بھتیجے بھانجے سب ہو گئے نثار
ہر لعلِ بے بہا کو ہمارا سلام ہو

اصغر کی ننھی جان پہ لاکھوں درود ہوں
مظلوم و بے خطا کو ہمارا سلام ہو

ہو کر شہید قوم کی کشتی ترا گئے
امّت کے ناخدا کو ہما را سلام ہو

ناصر ولائے شان میں کہتا ہے بار بار
مہمانِ کربلا کو ہمارا سلام ہو

انٹرنیٹ سے: سلام خواں: محمد اویس رضا قادری

کربلا کے بہادر بچے

□عذرا نقوی

محرم اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ ہے۔لیکن اس مہینے کے ساتھ یزیدی فوجوں کے ہاتھوں حضرت امام حسین کی شہادت اور ان کے خاندان پر ڈھائے گئے ظلم کی وہ غم ناک یادیں جڑی ہوئی ہیں جن کا سوگ آج چودہ سو سال بعد بھی منایا جاتا ہے۔اسلامی مہینے محرم کی دس تاریخ کو کربلا کے میدان میں (جو کہ اب عراق کا حصہ ہے) رسول اکرمؐ کے نواسے حضرت امام حسینؓ کے سارے خاندان کو ملک شام کے حاکم یزید کی فوجوں نے شہید کر دیا تھا اور ان شہیدوں میں بچے بھی شامل تھے۔اسی غم ناک واقعے کی یاد میں محرم میں سوگ منانے کے علاوہ لوگوں کے لیے شربت اور پانی کی سبیلیں بھی لگائی جاتی ہیں اور رسول اللہؐ کے خاندان کے ان بچوں بوڑھوں اور خواتین کی پیاس کو یاد کیا جاتا ہے جن پر یزید کی فوج نے فرات کی نہر کا پانی بھی بند کر دیا تھا۔واقعہ کچھ یوں تھا کہ یزید نے جو کہ دینِ اسلام میں بگاڑ پیدا کر رہا تھا اور کردار کا بھی خراب تھا اپنی حکمرانی کا اعلان کرنے کے بعد رسول اللہؐ کے خاندان کے لوگوں سے زبردستی اپنے ہاتھ پر بیعت کرانے کی کوشش کی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ان میں حضرت امام حسینؓ بھی تھے جنھیں یزید کی اطاعت کسی بھی صورت میں قبول نہیں تھی، لیکن وہ تشدد اور خون خرابے کے بھی خلاف تھے۔ان حالات میں امام حسین نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے نانا محمد مصطفےٰؐ کے دین کی حفاظت کے لیے اپنے وطن مدینہ سے نکلیں اور شہر کوفہ میں رہ کر تبلیغ دین کا کام کریں۔

امام حسینؓ اپنے اہل خاندان کے ساتھ مدینے سے کوفے کی طرف روانہ ہوئے۔مکہ مکرمہ ہوتے ہوئے جب وہ کوفے کے راستے میں تھے تو ان کے قافلے کو یزیدی فوج نے روک لیا اور انھیں کربلا کے میدان میں ہی رک جانے پر مجبور کر دیا۔فوج نے ان سے یزید کی اطاعت قبول کرنے کو کہا لیکن حضرت حسین نے اس سے صاف انکار کر دیا۔نتیجہ میں یزید کے فوجیوں نے انھیں اور ان کے بہتر 72 ساتھیوں کو بھوکا پیاسا رکھنے کے بعد شہید کر دیا۔

اس قافلے کے ساتھ بہت سے بچے بھی تھے۔کچھ نوجوان اور کچھ بہت چھوٹے۔نوجوانوں میں امام حسین کے بیٹے علی اکبر حضرت امام حسن کے بیٹے قاسم شامل تھے جنھوں نے شہادت پائی۔جب یزیدی فوجوں نے قافلے کو روکا تو حضرت علی اکبر نے والد سے پوچھا کہ بابا کیا ہم حق پر ہیں۔امام حسین نے کہا یقیناً ہم حق پر ہیں۔یہ سن کر علی اکبر نے کہا ”تو پھر میرے لیے شہید کی موت شہد سے زیادہ میٹھی ہے بابا۔“

ان کے علاوہ امام حسینؓ کی بہن حضرت زینب کے دو بیٹے عون اور محمد بھی تھے جنھوں نے کم عمری کے باوجود بہادری سے جنگ کی اور شہید ہوئے۔امام حسین کے چھ مہینے کے بیٹے علی اصغر کو یزیدی فوج نے تیر مار کر شہید کر دیا۔امام حسین کی ایک چھوٹی بیٹی سکینہ بھی تھیں۔ جب یزیدی فوج نے دریا پر قبضہ کر کے اس قافلے پر پانی بند کر دیا اور نہر فرات پر پہرہ بٹھا دیا تو چھوٹے چھوٹے بچے شدید گرمی میں پیاس

سے پریشان ہوگئے۔ امام حسینؑ کے بھائی حضرت عباس نہر فرات پر پانی لینے گئے۔ بڑی بہادری سے جنگ کر کے انھوں نے مشک میں پانی تو بھر لیا مگر جب واپس آنے لگے تو فوج نے حملہ کر کے انھیں بے رحمی سے شہید کر دیا۔ چچا کی شہادت کے بعد حضرت سکینہ اور دوسرے بچوں نے پھر کبھی یہ نہیں کہا ہمیں پیاس لگی ہے، اور یوں اپنی تکلیف کو وہ سب سے چھپاتے رہے۔

امام حسینؑ اور ان کے رفیقوں کی شہادت کے بعد خاندان کی خواتین اور خاندان کے اور بچے امام حسین کے بیٹے امام زین العابدین کے ساتھ سال بھر تک قید میں رہنے کے باوجود اپنے بزرگوں کی جدوجہد میں پوری طرح شامل رہے۔ واقعہ کربلا میں بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی چھوٹی چھوٹی عمروں کے باوجود یہ بچے امام حسین کے مقصد سے واقف تھے اور انھیں احساس تھا کہ ان کی یہ تکلیفیں اور پریشانیاں اسلام کی حفاظت کے لیے ہیں۔ کربلا کی لڑائی دراصل حق اور باطل کی لڑائی تھی جس میں فوجی طاقت کے زور پر فتح یزید کی ضرور ہوئی لیکن حق کا سر بلند رہا۔

ہندوستان کے عظیم مجاہد آزادی اور شاعر مولانا محمد علی جوہر نے کہا ہے:

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اسلام کی اس سربلندی میں حضرت امام حسین کے علاوہ ان بچوں کا بھی ہاتھ تھا جنھوں نے جسمانی طور پر کمزور ہوتے ہوئے بھی بڑی بہادری سے مصیبتوں اور اذیتوں کا سامنا کیا اور جہاں تک بھی ممکن تھا ظلم کے خلاف جدوجہد میں اپنے بزرگوں کا ساتھ دیتے رہے، ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ہاتھوں مارے بھی گئے اور شہادت کا درجہ پایا۔ آج ساری دنیا حضرت حسین کی امن پسندی، تشدد کے خلاف احتجاج اور ظلم کے آگے سر نہ جھکانے کے عمل کے ساتھ ساتھ کربلا کے ان بہادر بچوں کے صبر و ضبط اور ہمت کو بھی سلام کرتی ہے، جنھوں نے اپنے والدین اور اپنے بزرگوں کا مصیبت کے وقت میں بھی ساتھ دیا اور ان کی عزت و ناموس پر اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔ ■

Ms AzraNaqvi
Farhat Kada Sir Syed NagarAligarh-202002 UP

گرو نانک جینتی پر

□ محمد سراج عظیم

گرو کی نصیحت

لوگ جوق در جوق ان بزرگ کراماتی بابا کو دیکھنے چلے جارہے تھے۔اس چھوٹے سے شہر میں پچھلے تین چار دن سے یہ خبر پھیلی ہوئی تھی کہ ایک بہت بزرگ اور کراماتی بابا شہر میں آئے ہوئے ہیں۔لمبا قد، چہرے پر سفید لمبی داڑھی، سر پر سفید عمامہ، جسم پر سفید جبہ نما لباس، نورانی چہرہ اس پر بڑی بڑی چمک دار آنکھیں۔ایسا لگتا تھا جیسے آسمان سے اترا ہوا سفید براق فرشتہ۔لوگ باغ میں جاتے پیڑ کے نیچے بیٹھے بابا کے سامنے حاضر ہوتے۔ ان سے اپنے دکھ درد اور اپنی پریشانی بیان کرتے۔کوئی بیماری کے بارے میں تو کوئی کاروبار کے یا اپنی ترقی کے بارے میں تو کوئی آسیب اور جن بھوتوں کے بارے میں۔غرض اسی طرح کی بہت سی باتیں۔ہر آدمی اپنی جگہ پریشان تھا ہر شخص بابا سے اپنی پریشانی کے حل کے بارے میں پوچھتا۔ ان سے دعا، گنڈے، تعویذ کے لیے کہتا۔بابا سب کی باتیں اور پریشانی بہت دھیان اور خاموشی سے سنتے۔اس کے لیے دعا کرتے اس کو ڈھارس بندھاتے اور اللہ پر یقین رکھنے کی تلقین کرتے۔

وہ پتہ نہیں کیسے چمتکاری بابا تھے کہ گھر پہنچتے پہنچتے ہی لوگوں کو فائدہ ہونے لگتا۔اس بات سے ان کی شہرت شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھی۔اسی شہر میں ایک بہت امیر شخص لالہ دھنی رام بھی رہتا تھا۔اس کی حویلی بہت بڑی تھی جہاں پر بہت سے نوکر اور نوکرانیاں تھیں۔وہ شہر کا سب سے بڑا رئیس تھا اور اپنی تعریف کرانا پسند کرتا تھا۔دھنی رام تھا بہت شیخی خورہ، اپنی تعریف کے چکر میں بڑی سے بڑی بے وقوفیاں کیا کرتا تھا۔اس کی بیوی بہت ہوشیار اور چالاک تھی۔اس نے جو چمتکاری بابا کے بارے میں سنا تو لالہ سے ضد کرنے لگی کہ بابا کو اپنی حویلی میں کھانے کی دعوت دیجیے۔لالہ پیسہ خرچ کرنے کے معاملے میں کنجوس آدمی تھا۔وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔لیکن اس کی بیوی نے اسے سمجھایا کہ جب ہم اتنے پہنچے ہوئے بزرگ کی خدمت کریں گے تو بابا ہمیں جو دعا دیں گے تو ہمارے یہاں دولت کے انبار لگ جائیں گے۔لالہ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور وہ بابا کی دعوت کرنے پر راضی ہوگیا۔

لالہ دوسرے دن صبح ہی اپنے نوکر کے ساتھ ان کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔اس نے بابا کو اپنے یہاں کھانے پر آنے کی دعوت دی۔بابا نے پہلے تو انکار کردیا لیکن لالہ کے بہت اصرار کرنے پر دعوت قبول کرلی۔بابا نے دھنی رام سے وعدہ کرلیا کہ آج رات کا کھانا وہ اس کے ساتھ کھائیں گے۔دھنی رام نے خوشی خوشی گھر پہنچ کر اپنی بیوی کو اس کی اطلاع دی۔اس کی بیوی کی

خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ بابا کے لیے طرح طرح کے کھانے پکانے میں لگ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ گھر کی صفائی ستھرائی بھی کر دی۔ حویلی کے جس ہال میں بابا کو کھانا کھلانا تھا وہاں فرش پر قیمتی قالین، مخملی گاؤ تکیے، ریشمی پردے اور چاندی کے برتن لگانے کا انتظام کیا۔ اس نے نوکروں کو بھی ہدایت دی کہ بابا کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ رہ جائے اور خبردار بابا کو کسی بات پر ناراض نہ کر دینا۔ اس گھر سے بابا خوش ہو کر جائیں۔

آخر جیسے ہی سورج ڈوبا اور شام کا دھندلکا چھایا بابا، دھنی رام کے یہاں پہنچ گئے۔ لالہ شیخی خورہ تو تھا ہی وہ سمجھ رہا تھا کہ بابا کے ساتھ بہت سے لوگ آئیں گے تو شہر میں اس کی شہرت ہوگی لیکن یہ کیا؟ بابا اکیلے ہی کھڑاؤں پہنے کھٹ کھٹ کرتے اس کے گھر پہنچ گئے تھے۔ دھنی رام نے چونک کر بابا سے پوچھا ''ارے بابا آپ اکیلے آئے ہیں آپ کے شاگرد اور مرید وغیرہ نہیں آئے۔''

''ارے بچہ! ہر ایک اکیلا آتا ہے اور اس کو اکیلے ہی جانا ہے۔ بس فرق اتنا ہے دنیا میں وہ آتا ماں کی گود میں ہے اور دنیا سے جاتا چار لوگوں کے کندھوں پر ہے۔'' بابا نے بہت دھیمے دھیمے لہجے اور نیچی آواز میں کہا۔

دھنی رام بابا کا جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ اس نے پھر بابا سے پوچھا ''بابا کھانا لگوایا جائے۔'' بابا نے سر ہلا کر کہا جیسی تمہاری مرضی۔ لالہ نے نوکروں کو آواز دی اور کھانا لگانے کو کہا۔ کئی نوکر کھانا لگانے کے لیے دوڑ پڑے۔ بابا نے مسکراتے ہوئے پوچھا ''یہ سب اللہ کے بندے ایک آدمی کو کھانا کھلائیں گے۔''

''جی بابا یہ سب آپ کی خدمت کے لیے ہیں۔'' دھنی رام نے مکاری بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس نے آگے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''میرا تو نصیب کھل گیا کہ آپ جیسی ہستی جو اتنے پہنچے ہوئے سنت ہوں میرے گھر پر آئے۔ مجھے آشیرواد دیجئے کہ میں آپ کی اچھی طرح خدمت کر سکوں اور دنیا میں عیش (شہرت) کما سکوں۔''

''عیش تو بچہ اس کے لیے ہے جو سب سے بڑا ہے۔ جو سب کا داتا ہے۔'' بابا نے پھر آہستہ سے جواب دیا۔ اتنی دیر میں کھانا لگ چکا تھا۔ دھنی رام نے ایک نوکر سے بابا کے ہاتھ دھلانے کو کہا۔ نوکر ہاتھ میں پانی کا لوٹا لے کر دوڑا تو

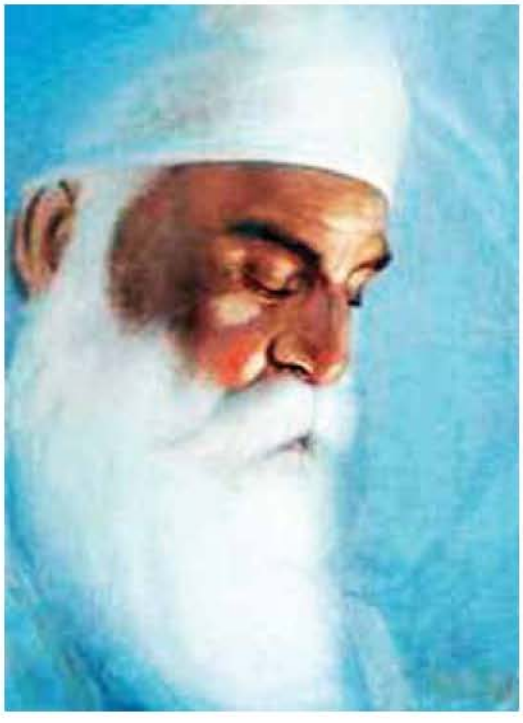

دوسرا چاندی کی سلفچی لیے بابا کے پاس پہنچا۔ ''ارے بچہ تم مجھ پاپی کو کیوں لجت (شرمندہ) کرتے ہو۔ میں یہاں آیا تھا تب ہاتھ دھو کر ہی آیا تھا۔''

دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ دھنی رام بابا کو کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ بابا اب اس کی تعریف کریں گے یہ سوچ سوچ کر وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ لیکن بابا نے کسی بھی کھانے پر دھیان نہیں دیا اور نہ کچھ بولے۔ انھوں نے ایک پلیٹ میں دال لی اور دو روٹیاں اور کھانا شروع کر دیا۔ لالہ بہت اصرار کرتا رہا کہ یہ سب آپ کے لیے پکوان بنوائے ہیں کچھ تو لیجیے۔ وہ خاموشی سے کھاتے رہے اور ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے رہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لالہ دھنی رام ایک دم افسردہ ہو کر بولا ''آپ اپنے بھگت سے ناراض ہیں اسی لیے آپ نے کچھ بھی پیٹ بھر نہیں کھایا۔''

''ارے بچہ سنسار میں سب دکھی ہیں۔ کوئی کسی سے ناراض ہوتا ہے تو یہ اس کا اہنکار (گھمنڈ) ہے۔ داتا کے بندے سب برابر ہیں اور کھانا بچہ تم نے ایک بوڑھے کے لیے اتنا پکوالیا۔ اس رب کی کتنی مخلوق تو بنا کھائے ہی

سوجاتی ہے۔"

دھنی رام خاموش تھا۔ بابا جانے کے لیے مڑ گئے تب اس نے پھر پوچھا "اب آپ کے درشن کب ہوں گے؟"

"بچہ انسان کا کوئی بھروسہ نہیں کب بلاوا آجائے۔ یہ دنیا تو آنی جانی ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ ایک دن پرماتما کے سامنے ضرور ملاقات ہوگی۔" انھوں نے اسی نرم آواز میں جواب دیا۔ باتیں کرتے کرتے وہ حویلی کے باہر آگئے۔ لالہ کم عقل آدمی تھا۔ ان کی کسی بات کا مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس کو اس بات سے بڑی مایوسی تھی کہ بابا نے اس کی حویلی، شان وشوکت اور کھانے کی تعریف نہیں کی تھی نہ ہی اس کو آشیرواد دیا تھا۔ وہ جلدی سے بول پڑا "بابا آپ کو حویلی، میرا رہن سہن کیسا لگا، میں جلدی ہی آپ سے دوبارہ ملوں گا۔" بابا رک گئے اور اپنے جبے کی جیب سے ایک چھوٹی سی سلائی نکال کر اس کو دیتے ہوئے بولے "جب تم ہم سے ملو تو ہماری یہ سلائی ساتھ میں لیتے آنا۔" دھنی رام نے خوشی خوشی وہ سلائی لے لی۔

اس نے ایک بار پھر پوچھا "حویلی کیسی لگی۔" بابا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور خاموشی سے چلے گئے۔

دھنی رام خوشی خوشی گھر واپس آیا اور اپنی بیوی کو اپنے اور بابا کے درمیان ہوئی ساری بات چیت بتائی اور بابا کی دی ہوئی سلائی اس کو دکھائی۔ اس کی بیوی بابا کی باتوں کو سمجھ گئی تھی۔ اس نے دھنی رام سے کہا "ارے احمق بابا نے تم سے ساری باتیں اشاروں میں کی تھیں۔ تم ان کا مطلب نہیں نکال سکے۔ یہ سلائی انھوں نے تمہیں اس لیے دی ہے کہ جب تم مرنے کے بعد اوپر پہنچو تو بابا کی سلائی اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔ ارے کیا کوئی مرنے والا اپنے ساتھ کسی کی کوئی چیز لے جاسکتا ہے۔ جاؤ جلدی جاؤ بابا کو ان کی سلائی واپس کردو اور ان سے معافی مانگو۔"

دھنی رام اپنی بیوی کی بات سن کر الٹے پیر بابا کے پاس بھاگا۔ اس نے بابا سے کہا "بابا مجھے معاف کردیں میں آپ کی یہ سلائی اپنے ساتھ نہیں لاسکتا۔ آپ مہربانی کرکے اسے واپس لے لیں۔"

بابا نے سلائی لیتے ہوئے کہا "بچہ جب تم مرنے کے بعد اتنی چھوٹی سی سلائی اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے تو یہ حویلی، یہ شان وشوکت یہ جھوٹی شہرت اور دولت کیسے ساتھ لے جاسکتے ہو۔ تو بیٹا تمہیں اوپر والے نے اتنا دیا ہے تو اس سے اللہ کے بندوں کا بھلا کرو ان پر خرچ کرو ان کی مدد کرو اور ان کی دعائیں لو۔ کیوں کہ تمہاری نیکیاں اور لوگوں کی دعائیں ہی تمہارے کام آئیں گی۔" دھنی رام اپنے گھر واپس آگیا اور بابا ہمیشہ کے لیے اس شہر سے چلے گئے۔

کہتے ہیں کہ دھنی رام پر بابا کی نصیحت کا ایسا اثر ہوا کہ اس نے سارا دھن دولت غریب اور ضرورت مند لوگوں میں بانٹ دیا، اور خود ایک فقیر کی زندگی گذارنے لگا۔

بچو! معلوم ہے یہ بابا کون تھے۔ یہ گرونانک صاحب تھے۔ سکھ دھرم کے بانی۔ آگے چل کر خود دھنی رام بھی ایک بہت بڑے سنت بنے۔ □

Mr Mohd Siraj Azeem
A-47 Zakir Bagh , Okhla Road Jamia Nagar New Delhi-110025

□ سمیع الدین خاں شاداب

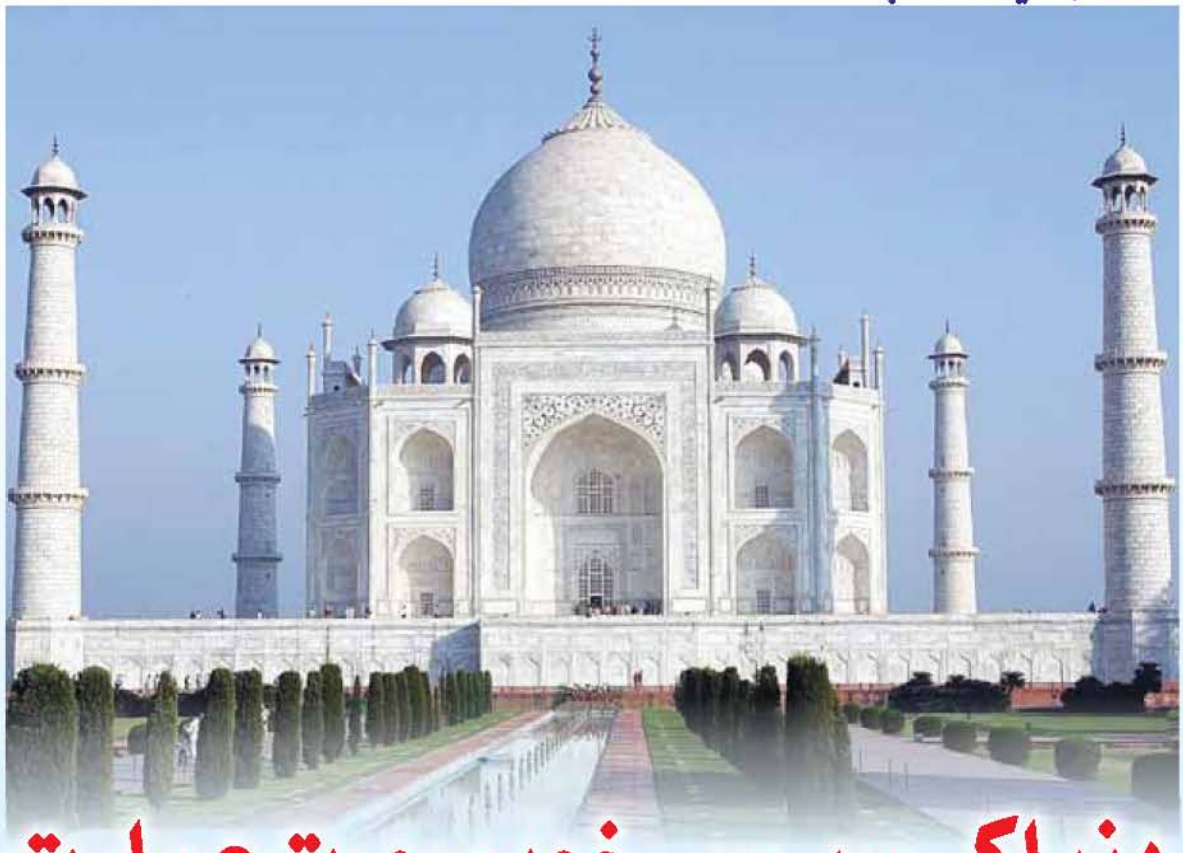

دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت

آپ نے تاج محل تو ضرور دیکھا ہوگا۔ کچھ بچوں نے اس کو آگرہ شہر میں اصلیت میں دیکھا ہوگا اور زیادہ تر نے کتابوں میں گریٹنگ کارڈ میں، کیلنڈر میں، ٹی وی پر یا پھر بہت سی چیزوں کے پیکٹوں یا ڈبوں پر بنی ہوئی تاج محل کی تصویر دیکھی ہوگی۔ بچو! تاج محل یوں تو ایک شہنشاہ اور اس کی ملکہ کا مقبرہ ہے لیکن یہ دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت ہے۔ آیئے! آج ہم آپ کو اس خوبصورت عمارت کے بارے میں کچھ جانکاری دیں۔

تاج محل پانچویں مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے بنوایا تھا جس کا اصل نام محمد شہاب الدین تھا۔ وہ شہنشاہ نورالدین جہانگیر کا بیٹا اور مغل اعظم جلال الدین محمد اکبر کا پوتا تھا۔ جہانگیر کی موت (1627) کے بعد شاہ جہاں ہندوستان کا شہنشاہ بنا۔

شاہ جہاں کی شادی 1612 میں سوتیلے ماموں آصف خاں کی بیٹی ارجمند بانو سے ہوئی۔ شہنشاہ نے اپنی ملکہ کو ممتاز محل کا خطاب دیا۔ شادی کے وقت ممتاز محل کی عمر 20 برس تھی۔ اس کا انتقال 1631 میں ہوا۔ اس کی چودہ اولادیں ہوئیں لیکن ان میں سے صرف سات ہی زندہ رہیں۔ 1931 میں جب ممتاز محل کا انتقال ہوا اس

وقت شاہجہاں اور ممتاز محل برہان پور میں تھے۔ وہیں ایک بچی کی پیدائش کے دوران ملکہ کا انتقال ہوا۔ تاپتی ندی کے کنارے زین آباد باغ میں ممتاز محل کو دفن کیا گیا اور کچھ مہینے بعد اس کی قبر کو آگرہ منتقل کر دیا گیا اور یہیں آگرہ میں 1632 میں ممتاز محل کے مقبرے کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

ممتاز محل کی موت کے وقت اس کی عمر 39 برس تھی اس کی موت پر شاہ جہاں اتنا افسردہ تھا کہ اس کا سوگ دو سال تک منایا گیا۔ کسی بھی قسم کا جشن یا موسیقی کی محفلیں شاہی دربار میں نہیں ہوئیں۔ شاہ جہاں ویسے بھی عمارتیں بنوانے کا بہت شوقین تھا۔ ملکہ کی موت کے بعد اس نے طے کیا کہ وہ اپنی پیاری ملکہ کے لیے ایسی یادگار عمارت بنوائے گا جو اس کے پیار کو ظاہر کرے گی۔ اس طرح جمنا ندی کے کنارے پر خوبصورت اور بڑے باغوں کے درمیان 1632 میں یہ یادگار عمارت تاج محل بننا شروع ہوئی۔

دنیا بھر کے کئی ملکوں کے ماہر کاریگروں اور 20,000 سے زیادہ معماروں، مزدوروں، خطاطوں، سنگ تراشوں نے تقریباً 22 برس تک دن رات محنت کر کے دنیا کے سامنے ایک بے مثال خوبصورت عمارت کھڑی کر دی۔ خاص مقبرے یعنی تاج محل کا کام 1632 سے 1648 تک چلا جبکہ اس سے متعلق دیگر عمارتوں کا کام تو بائیس برس تک چلتا رہا۔

تاج محل کو سفید رنگ سنگ مرمر سے نہایت نفاست سے تعمیر کیا گیا

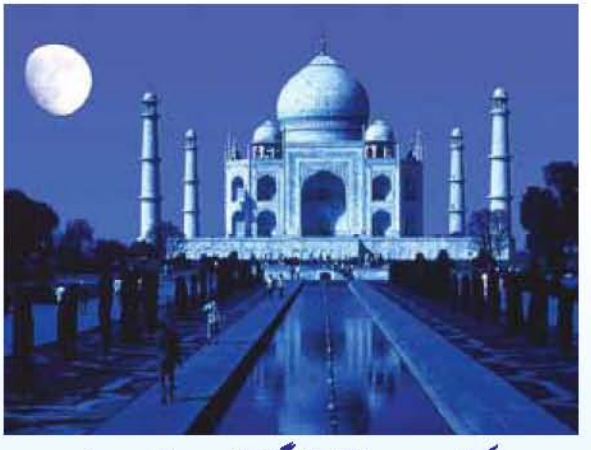

ہے۔ اس کی نفاست اور باریک کاریگری کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ گنبد اور دروازے پر بنی گل کاری میں ہر ایک پھول کی پنکھڑی کو بنانے میں چالیس سے بھی زیادہ قیمتی پتھروں کے ٹکڑوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ یہ پھول اتنی مہارت، باریکی اور نفاست سے تیار کیے گئے ہیں کہ بہت غور سے دیکھنے کے بعد بھی پھولوں کی پنکھڑیوں کے جوڑ تلاش کر پانا تقریباً ناممکن ہے۔

اور بچو! آپ کو یہ جان کر بھی تعجب ہوگا کہ دن بھر میں مختلف اوقات کے ساتھ ہی تاج محل کے پتھروں کا رنگ بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے گویا کہ پتھر بھی وقت کے ساتھ اپنا مزاج بدلتے ہیں۔

یہ صبح کے وقت سرخی لیے ہوئے گلابی رنگ Blushing Pink رنگ کا ہوتا ہے اور شام کو جب سورج ڈوبتا ہوتا ہے اور شفق پھوٹتی ہے تو اس کا رنگ گہرا لال ہو جاتا ہے اور چاندنی رات میں تو اس کی خوبصورتی پوری دنیا میں مشہور ہے۔ تب یہ آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والا موتی جیسا سفید دکھائی دیتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کاریگروں اور فنکاروں نے تاج محل کے پتھروں کو تراشتے وقت کتنی باریکی اور ہنرمندی سے کام لیا ہوگا کہ ان کی محنت نے بے جان پتھروں میں بھی جان ڈال دی ہے۔

تاج محل کا خاکہ فن تعمیر کے کس ماہر کے دماغ کی دین ہے اس کا جواب آج بھی یقینی طور پر نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا میرِ عمارت یعنی Chief Architect عام طور سے احمد لاہوری کو مانا جاتا ہے لیکن کچھ

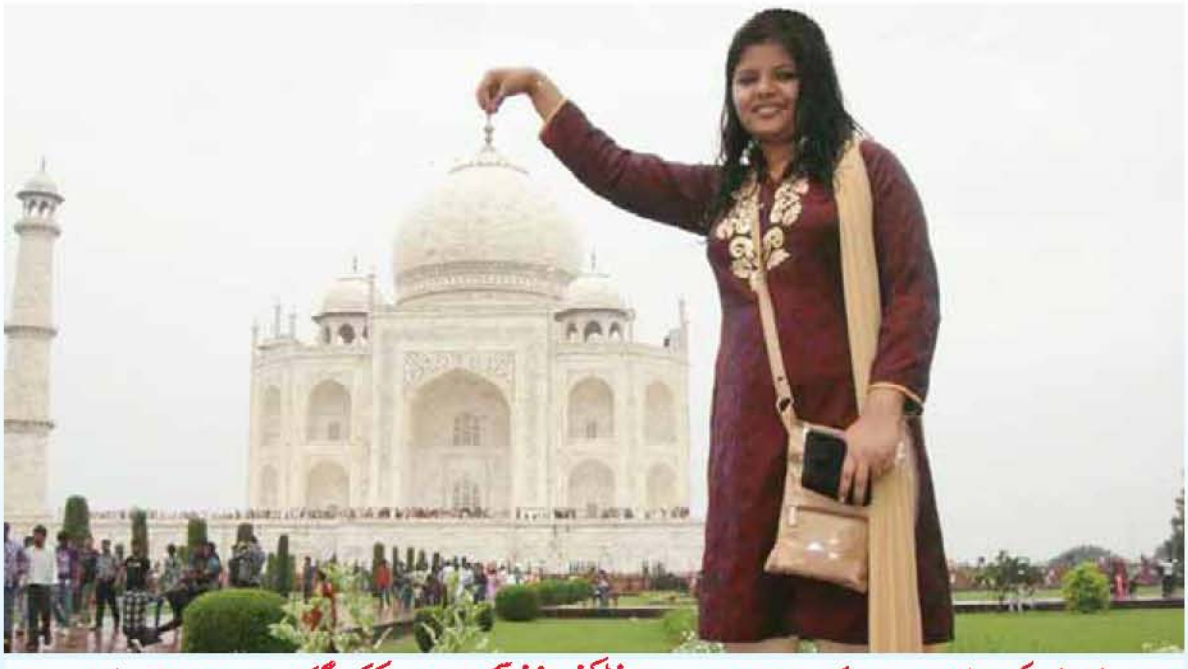

تاج سے نوجوانوں کی محبت کا جنون ایسا ہے کہ وہ خاص زاویے سے ایسا فوٹو کھنچوانا فرض سمجھتے ہیں جسے دیکھ کر لگے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں

لوگ ترکی کے استاد عیسیٰ کو اس کا خاکہ تیار کرنے والا مانتے ہیں۔ فرانس اور اٹلی بھی اس بات کے دعویدار ہیں کہ تاج محل ان کے ملک کے فنکاروں کے دماغ کی پیداوار ہے۔ اس تنازعے کے باوجود ہم یہ تو بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ لگ بھگ دو سو سال تک بننے والی مغلوں کے دورِ حکومت کی شاندار عمارتوں کا نقطۂ عروج تاج محل ہی ہیہاں ایک بات اور۔ شاہجہاں کے پردادا شہنشاہ ہمایوں کا جو مقبرہ دہلی میں بستی حضرت نظام الدین کے قریب واقع ہے، اس سے تاج محل کا خاکہ کافی حد تک ملتا جلتا ہے۔ لیکن خاص فرق یہ ہے کہ وہ سارے کا سارا سنگ مرمر کا بنا ہوا نہیں ہے اور اس کے گرد تاج محل جیسے چار مینار بھی نہیں ہیں۔

تاج محل مکرانہ کے سفید رنگ سنگ مرمر سے بنا ہوا ہے۔ مکرانہ راجستھان کے ضلع ناگور میں واقع ہے۔ تاج محل کی تعمیر کے لیے سامان پورے ہندوستان اور وسطی ایشیا سے منگایا گیا۔ مکرانہ سے سفید سنگ مرمر لایا گیا تو قیمتی پتھر جیسے عقیق، یشب، سنگ یمانی وغیرہ بغداد، مصر، روس، افغانستان، ایران، ہیلون (سری لنکا)، گولکنڈہ، پنجاب وغیرہ سے منگائے گئے۔ اس طرح مغل فنِ تعمیر کے اس شاہکار کو بنانے کے لئے پورے ہندوستان اور تقریباً پوری وسط ایشیاء سے ساز و سامان مہیا کرائے گئے۔ کہتے ہیں کچھ بہت ہی اعلیٰ

قسم کا سنگ مرمر اٹلی سے بھی سمندری جہاز میں بھر کر منگایا گیا تھا۔ ان قیمتی پتھروں سے بنا ہوا تاج محل دریائے جمنا کے دائیں کنارے پر واقع باغوں کے درمیان ایک خوبصورت نگینے کی طرح لگتا ہے۔

تاج محل اور اس سے ملحقہ عمارتیں 850 میٹر لمبے اور 340 میٹر چوڑے چوکور رقبے پر بنے ہیں۔ اس کے شمال میں دریائے جمنا بہہ رہا ہے۔ مقبرہ 18 فٹ (تقریباً ساڑھے 5 میٹر) اونچے اور 313 فٹ (تقریباً 95 میٹر) مربع چبوترے کے بیچ میں بنا ہے۔ چبوترے کے ہر کنارے پر ایک ایک مینار ہے اور ہر مینار کی اونچائی 313 فٹ یعنی تقریباً 95 میٹر ہے۔ ہر ایک مینار میں تین چھجے ہیں اور چوٹی پر ایک چھتری بنی ہے۔ مقبرے کے اندر کا وسطی کمرہ اور اس کے چاروں کونوں پر بنے چھوٹے کمرے ہشت پہلو Octogonal اور 74 فٹ (تقریباً ساڑھے 22 میٹر) اونچائی کا شاندار گنبد ہے۔ اس کے ہر رخ پر 33 میٹر اونچا محراب دار طاق ہے اور ہر رخ پر ایک چھوٹا سا دو منزلہ نشیمن ہے جس پر قبضہ دار چھتریاں بنی ہوئی ہیں۔ محراب دار حصے کے باہری رخ دو منزلوں میں بنٹے ہیں اور ان میں چھ محراب دار طاق بنے ہیں جن میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہیں۔

ممتاز محل کی قبر

تاج محل میں شہنشاہ شاہ جہاں اور ان کی ملکہ ممتاز محل کی قبریں ہیں۔ ان دونوں کی اصل قبریں تو تاج محل میں نیچے تہ خانے میں ہیں لیکن اصل قبروں کے ٹھیک اوپر درمیانی گنبد کے نیچے بیچوں بیچ علامتی قبروں کے تعویذ بنے ہیں ان دونوں

تعویذوں پر کتبے لگے ہیں جن کے چاروں طرف سفید سنگ مرمر کی باریک کناری دار جالیوں کا کٹہرہ بنا ہے جن سے چھن چھن کر روشنی اصلی قبروں تک پہنچتی ہے۔ یہ کٹہرہ اپنی نزاکت اور خوبصورتی میں بے مثال ہے اس پر قیمتی پتھروں سے بہت باریک اور نفیس بیل بوٹے بنے ہیں۔ کٹہرے کے اردگرد قرآن مجید کی آیات سیاہ سنگ مرمر کی پچی کاری سے لکھی گئی ہیں۔ زیادہ تر کتبے شاہ جہاں کے وزیر افضل خاں

شیرازی کے بھائی عبدالحق شیرازی کے بنائے ہوئے ہیں۔ دونوں قبروں کو قیمتی پتھروں سے سجایا گیا ہے ممتاز محل کی قبر پر اللہ کے 99 صفاتی نام بہت ہی خوبصورتی سے لکھے گئے ہیں۔ ممتاز محل کی قبر کے بغل میں مغرب کی طرف شاہ جہاں کی قبر بھی ہے حالاں کہ یہ تاج محل کی تعمیر کے اصل مقصد میں شامل نہیں رہی ہوگی۔

مقبرے میں داخلے کے لیے کافی اونچا دروازہ ہے جو فنِ تعمیر کا ایک حسین نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ مقبرے کے مشرق اور مغرب کی جانب ایک جیسی دکھائی دینے والی عمارتیں ہیں۔ ان میں سے ایک بہت خوبصورت مسجد ہے اور دوسری طرف مہمان خانہ ہے۔ مقبرے کے جنوب میں ایک بڑا باغ ہے۔

آج تاج محل ایک شہنشاہ کے عظیم خواب سے کہیں زیادہ ایک قومی وراثت اور قومی وقار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ تاج محل پوری دنیا میں ہندوستان کی پہچان اور شان ہے۔ تو بچو! اب کی بار سالانہ چھٹیوں میں آپ دنیا کی اس حسین ترین عمارت اور ہندوستان کی شاندار وراثت کو دیکھنے ضرور جایئے۔□

Dr Samiuddin Khan Shadab
Maejid Zahuruddin, Gujar Tola Rampur UP - 244901

□بانو سرتاج

پٹاخوں کی کہانی

دیوالی آئی نہیں کہ بچوں کے دل میں پٹاخے پھوٹنے لگتے ہیں۔ایک ایک دن انتظار کا بڑی مشکل سے کٹتا ہے۔ دیوالی میں سچ مچ کے پٹاخے اڑانے کو جو ملتے ہیں۔ چھوٹے بچے پھلجھڑی جلتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں تو بڑے بچے بم اور راکٹ اڑا کر۔ باقی بچوں کے لیے قسم قسم کے پٹاخے انار، چکری، لڑی، سانپ وغیرہ ہوتے ہیں مگر یہ بات طے ہے کہ ہر عمر کا بچہ پٹاخوں سے خوش ہوتا ہے۔ بچو! آج بات کرتے ہیں پٹاخوں کی کہ ان کا آغاز کب ہوا، کس ملک میں ہوا اور کیسے ہوا؟

ایک کہانی کے مطابق برسوں پہلے ملک چین میں ایک باورچی نے کھانا بناتے وقت کئی مسالے ملا کر دیگچی میں ڈالے۔ جس سے زور کا دھماکہ ہوا۔ بس اسی فارمولے پر پٹاخے بننے لگے۔ رفتہ رفتہ پٹاخے بنانے کے عمل میں سدھار ہونے لگا۔ پٹاخے بانس سے بنائے گئے۔ وہ ایکو فرینڈلی پٹاخے ہوتے تھے جو ماحول کو خراب نہیں کرتے۔ ان میں فاسفورس کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔

پٹاخوں کے لیے ہرے بانس کام میں لائے جانے لگے۔ بانس کی گانٹھیں پھوٹتیں تو زوردار آواز ہوتی۔ تب لوگ مانتے تھے کہ اس آواز سے بری آتمائیں بھاگ جاتی ہیں۔

بری آتمائیں چین میں نیان Niyan کہلاتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ آتمائیں دھماکوں سے ڈرتی ہیں اس لیے انہیں بھگانے کے مقصد سے لوگ اکثر ایک مقام اور ایک ہی موقع پر جمع ہوکر بانس جلانے لگے۔ یہ موقع پا آچک Pa Aa Chak کہلایا۔

بعد میں جب بارود دریافت ہوا تو اس پا آچک کی شکل بھی بدلی۔ بارود کا برادہ بانسوں میں بھر لیا جاتا اور پھر بانس آگ میں پھینک دیے

پرانے زمانے میں بارود سے چلنے والی چینی بندوق کی نلی

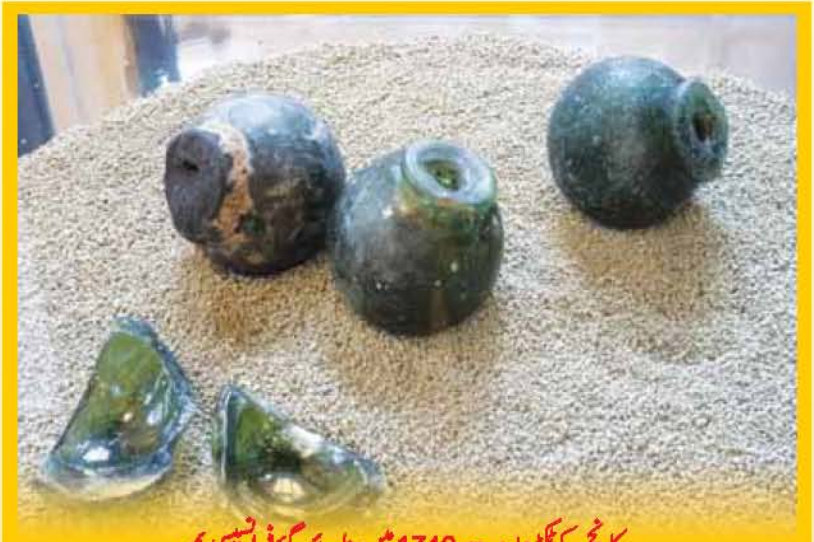

کانچ کے ٹکڑوں سے 1740 میں بنائے گئے فرانسیسی بم

جاتے۔ اس سے دھماکوں میں تیزی آئی اور چنگاریاں بھی نکلیں۔ پانچویں صدی سے مذہبی تہواروں میں اس طرح کے پٹاخوں کا استعمال شروع ہوا۔

300 قبل مسیح (حضرت عیسیٰؑ سے تین سو سال پہلے) بارود کی دریافت ملک چین میں ہی ہوئی تھی۔ پروفیسر کیرنگٹن گڈرچ Kairington Goodrich نے اپنی کتاب Ashort Histort of China (چین کی مختصر تاریخ) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

سن 960 سے 1275 کے درمیان ہوئی جنگوں میں چینیوں نے بارود کا استعمال کیا تھا۔ گڈرچ کے بیان کے مطابق 618 سے 906 عیسوی کے درمیان چینی دھوئیں کے تیر اور سانپ تیر وغیرہ پٹاخے بنانے لگے تھے۔ انہوں نے تیہہ ہیو پیو Teeh Hayo Payo نامی ایک گولہ بنایا تھا اور اسے جنگ میں استعمال کرتے تھے۔ اسے مزید طاقت ور بنانے کے لیے بانس کے خول کی جگہ لوہے اور تانبے کی نلیاں استعمال کی جانے لگیں۔ گیارہویں صدی میں منگولوں کے خلاف لڑائیوں میں چینیوں نے جنگ جیتنے میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔

چینیوں نے اپنا یہ فن کافی عرصہ تک راز میں رکھا مگر منگولوں نے جنگ کے بعد چینی کیمیا گروں Chemists کو گرفتار کر کے ان سے یہ فن سیکھ لیا۔ منگولوں نے ہی اس فن کو فارس یعنی ایران پہنچایا۔

پٹاخے بنانے کے فن کو چین سے باہر لے جانے میں مارکو پولو نے بھی اہم رول ادا کیا۔ پہلے مڈل ایسٹ اور پھر یوروپ میں پٹاخے اسی کے ذریعہ پہنچے۔

برٹش اسکالر راجر بیکم Roger Becum نے بارود میں کافی سدھار کیے اور پٹاخوں میں اس کا استعمال ہونے لگا۔ 1550 میں بارود میں 75% پوٹاشیم نائٹریٹ، 10% گندھک اور 15% چارکول ملا کر آمیزہ بنایا گیا جو آج تک اسی طرح استعمال ہو رہا ہے۔

پٹاخوں میں پہلے صرف سفید اور نارنگی چنگاریاں نکلتی تھیں۔ انیسویں صدی میں رنگین آتش بازی بننے لگی۔ اس کے لیے بارود میں مختلف دھاتیں ملائی جانے لگیں۔ بیریم ملانے سے ہری، تانبہ ملانے سے نیلی، سوڈیم ملانے سے پیلی، اسٹرانشیم ملانے سے لال چنگاریاں نکلنے لگیں۔ پوٹاشیم نائٹریٹ کی جگہ پوٹاشیم کلوریٹ کے استعمال سے زیادہ دلکش رنگ نکلنے لگے۔ میگنیشیم اور ایلومونیم کا برادہ آتش بازی کے مسالے میں ملا دینے سے چمک میں اضافہ ہوا، اور بہترین آواز والے

ایک پرانی فرانسیسی توپ: بارود کے گولوں کا اس میں استعمال ہوتا تھا

کوریا کے پرانے بارودی تیر جنھیں ہمارے یہاں ہوائی یا راکٹ کہتے ہیں

بھارت میں قدیم زمانے سے پٹاخوں کا رواج تھا۔ سنسکرت کی مشہور کتاب 'شک نیتی' Shuk Neeti میں اگنی چورن (آگ کا برادہ) بنانے کا نسخہ دیا ہوا ہے۔ ایک گولے کا ذکر ہے جو اونچائی سے پھینکا جاتا تو ایک زوردار دھماکہ ہوتا اور رنگ برنگے شعلے نکلتے۔ اس کتاب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بارہویں صدی کے آخیر میں بھارت میں اگنی کریڑا Agni Krida یعنی آتش بازی کا رواج تھی۔ رامائن اور مہابھارت میں بھی کئی جگہوں پر پٹاخوں کا ذکر ہوا ہے۔ شتاگنی بان یا تیر Shatagni Bomb ان میں خاص تھے۔ تاریخ میں ایک واقعہ درج ہے کہ سکندر اعظم اور اس کی فوج کو ایک مرتبہ بھارت کی

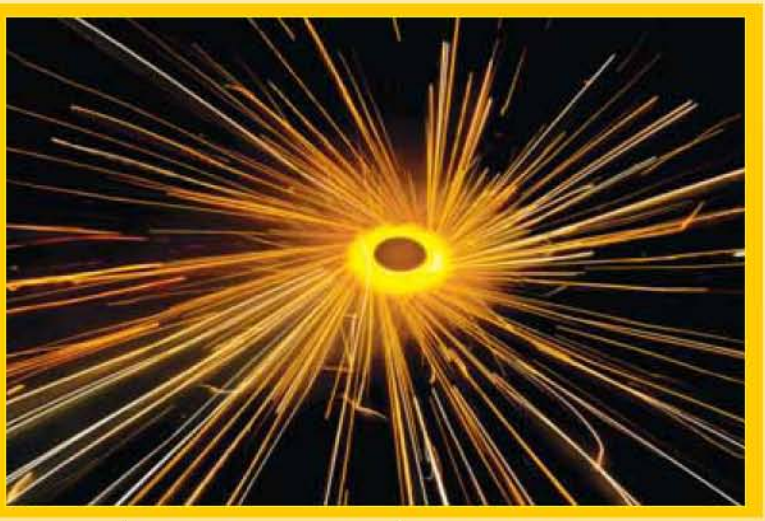

پرجا (عوام) نے گھیر لیا تھا تب وہ جلتے ہوئے بانس لے کر آگے بڑھے۔ جن کے سروں پر آگ لگا دینے سے روشنی ہوئی اور بانس کی گانٹھیں پھوٹنے سے بھیانک آوازیں نکلیں جس سے خوفزدہ ہونے پر محاصرہ ٹوٹ گیا تھا اور لوگ خوف زدہ ہوکر بھاگ نکلے تھے۔

اکبر اعظم کے دور کے عالم ابوحسن نے ذکر کیا ہے کہ اکبر دیوالی کے موقع پر آتش بازی کے مظاہرے کروایا کرتا تھا۔ ایسے ہی بیان جہانگیر اور شاہجہاں کے دورِ حکومت میں بھی ملتے ہیں۔

بھارت کے رہنے والوں نے پرتگالیوں سے یہ فن سیکھا۔ ایل ڈی ویرتھیما LDVeerthima اور نکولو کانٹی Nicholo Kanti نامی غیر ملکی

اور دلکش رنگوں والے پٹاخے بننے لگے جو بہت خوبصورت لگتے تھے۔

امریکہ میں آتش بازی یا پٹاخوں کا چلن سترہویں صدی سے شروع ہوا۔ انگلینڈ میں 1486 میں ہنری ہفتم Henry VII کی شادی کے موقع پر آتش بازی شروع ہوئی اور اتنی مقبول ہوئی کہ ہر جشن میں یہاں تک کہ سرکاری پروگراموں میں بھی آتش بازی ہونے لگی۔ 1558 میں انگلینڈ کی مہارانی کے سفر کے دوران ان کا استقبال پٹاخوں کے ذریعہ کیا گیا۔ وہاں پٹاخہ ماسٹر کی پوسٹ بنائی گئی۔ خود مہارانی اس پوسٹ پر کسی ماہر پٹاخہ بنانے والے کا تقرر کرتی تھیں۔

پیرس میں آتش بازی کا خوب صورت مظاہرہ

سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں بھارت کی آتش بازی کا حیران کن بیان کیا ہے۔ یہاں اس فن نے اتنی ترقی کی کہ اٹھارویں صدی کے آخیر میں ٹیپو سلطان نے لارڈ ویلزلی کے خلاف جنگ میں راکٹ کا استعمال کیا تھا۔اس وقت تک انگریز اس تکنیک سے ناواقف تھے۔

جنوبی ہندوستان میں شوکاشی، پٹاخوں کا سب سے بڑا مرکز

جنوبی ہندوستان کے شہر شوکاشی میں پٹاخوں کی ایک فیکٹری

ہے۔1960 میں جب ملک میں بے روزگاری بہت زیادہ بڑھ گئی تھی شوکاشی کے لوگوں نے باہمی مدد سے چھوٹی صنعتوں کا آغاز کیا۔ پٹاخہ بنانے کی صنعت بھی ان میں ایک تھی۔ بغیر کسی سرکاری مدد کے یہ شہر صنعتی شہر بن گیا۔لوگ خوش حال ہوگئے۔

پنڈت نہرو نے جب شوکاشی شہر کا دورہ کیا تو اسے کٹی جاپان Kitty Japan کا نام دیا(کٹی لفظ کے معنی ہیں چھوٹا، یعنی چھوٹا جاپان) اور یہاں کے لوگوں کے حوصلہ کو بہت سراہا۔ بھارت میں بننے والی ماچس کا 80% حصہ اور پٹاخوں کا 90% حصہ شوکاشی میں تیار ہوتا ہے۔

بھارت میں پونے، آکولہ، احمد آباد، کانپور، آگرہ، جھانسی، کولکاتہ وغیرہ میں پٹاخہ فیکٹریاں قائم ہیں۔

آتش بازی کے موضوع پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن سے آتش بازی میں آنے والی تبدیلیوں کا پتہ چلتا ہے۔ اٹلی کے لبیری ڈانیم Liberry Danium نے 1300 میں اس موضوع پر ایک

مہاراشٹر کے شہر پنے میں دیوالی کی ایک رات کا دل فریب منظر

کتاب لکھی جس میں پٹاخوں کے لیے طرح طرح کا بارود بنانے کے 20 نسخے دیے گئے ہیں۔

1432 میں فرانس کے ایلن باف Elenbaff نے ایک کتاب لکھی جس میں پٹاخوں میں بارود کے استعمال پر بحث کی گئی ہے۔

اٹھارہویں صدی میں ڈے فے زئیر De Feziar نے رنگین آتش بازی پر کتاب تخلیق کی۔

دیوالی کے تہوار کے ساتھ پٹاخوں کا ذکر لازم وملزوم ہے۔ اس تہوار میں بھارت میں پچاس ساٹھ کروڑ روپیوں کی آتش بازی ہر سال چھوڑی جاتی ہے۔ مگر ایک بات پٹاخوں کے سلسلہ میں بے حد اہم ہے۔ پٹاخے چلاتے وقت اکثر غفلت برتنے سے نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ پٹاخوں کو ماچس یا موم بتی کی لو سے جلانا، ایک ساتھ کئی پٹاخے چلانا، جلتی ہوئی پھلجڑی اور چکری Spin wheel کو اوپر اچھالنا، مٹکوں، ٹین کے ڈبوں میں بند کر کے پٹاخے چلانا بے حد خطرناک ہے۔ اس سے چہرہ جلنے کا اور دوسری طرح سے بھی نقصان ہوسکتا ہے۔ پٹاخے اوپر سے نیچے کھڑے لوگوں پر گر سکتے ہیں۔ راکٹ، ہوائی جہاز بموں میں گیس نکلنے کے لیے ایک چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے جس سے گیس بہت تیزی سے باہر نکلتی ہے۔ اسی دباؤ کے سبب وہ اوپر آسمان کی طرف جاتے ہیں۔ کئی مرتبہ وہ سوراخ تھوڑا ٹیڑھا رہ جاتا ہے اس سے راکٹ سیدھا اوپر نہ جا کر گولائی میں گھوم کر نیچے آجاتا ہے اور پٹاخے چلانے والوں ہی کو نہیں، راہگیروں کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کچھ پٹاخوں میں گھٹیا مال استعمال کیا جاتا ہے جس سے وہ جلدی نہیں جلتے، اس وقت انہیں دوبارہ جلانے کی کوشش میں اچانک پھٹ کر وہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس لیے پٹاخے پڑوں کی نگرانی میں کھلی جگہ پر چلانے چاہیں۔

پٹاخوں سے دوسرا نقصان ماحول کی آلودگی کا ہے۔ پٹاخوں سے نکلنے والے دھماکوں سے قوت سماعت پر برا اثر پڑتا ہے۔ پٹاخوں سے نکلنے والی گیس پھیپھڑوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ پودے اور پیڑ جھلس جاتے ہیں۔ اس خطرہ سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ پٹاخے یا تو استعمال ہی نہ کیے جائیں یا پھر کھلے میدان میں یہ شوق پورا کیا جائے تاکہ صحت پر برا اثر نہ پڑے اور زمین کا ماحول خراب نہ ہو۔ □

Dr Bano Sartaj
Opposite Akashwani, Civil Lines Chandrapur - 442401 MS

□ محبوب راہی

پیارے چاچا

ہندوستان کے رہبر نہرو
سب بچوں کے دلبر نہرو
جنگ وجدل سے نفرت جن کو
امن کے تھے پیغمبر نہرو
اور بھی نیتا تھے بھارت میں
لیکن سب سے بہتر نہرو
فولادی چٹان عزم کی
ہمت کے تھے سمندر نہرو
تن من دھن سے لحہ لحہ
قرباں تھے بھارت پر نہرو
دیش کی بہبودی کی خاطر
کوشاں تھے جیون بھر نہرو
سرخ گلاب کو اور بچوں کو
رکھتے دل سے لگاکر نہرو

بچوں کے تھے پیارے چاچا
اور بڑوں کے دلبر نہرو
دنیا بھر میں مان تھا ان کا
عظمت کے تھے پیکر نہرو
تخت نہیں تھا تاج نہیں تھا
کر گئے راج دلوں پر نہرو
چمکیں گے تاریخ میں صدیوں
بن کر ماہِ منوّر نہرو
ڈال گئے بھارت کو راہی
عظمت کے رستے پر نہرو

Dr Mahboob Rahi V&P.O Barsi Takli, Distt Akola - 444401(Mah)

محمد مبشر نوید

چاچا چودھری کے خالق کارٹونسٹ پران

''موجودہ زمانہ میں عام ہندوستانیوں کی زندگی مختلف قسم کے ٹینشن، تفکرات اور خوف سے بھری پڑی ہے۔ میری یہ ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ عام لوگوں کے ان تمام نفسیاتی مسائل کو حل کروں۔ میں اپنے کارٹونس کے ذریعہ یہ کوشش کرتا رہوں کہ صبح سویرے اخبار پڑھتے ہوئے عام قاری کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ بکھر جائے اور ان کا دل و دماغ دن بھر تازہ رہے۔''

مشہور کارٹونسٹ اور کامکس رائٹر پران کمار شرما کے یہ الفاظ شاید برسہا برس تک یاد آتے رہیں گے کیوں کہ وہ کامکس کی دنیا کے بے تاج بادشاہ تھے۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہو گیا اور زندگی بھر سب کو ہنسانے والا یہ فنکار اپنے چاہنے والوں کو رلا کر چلا گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں وہ مزاح کے ذریعہ زندگی کا بہت بڑا فلسفہ بیان کر دیتے تھے۔ ان کے بے ساختہ جملے پڑھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ واقعی کارٹون نگاری بھی اسی طرح ادب کا ایک حصہ ہے جس طرح طنز و مزاح، شوخی و ظرافت ہیں۔

پران کمار شرما کی پیدائش 15 اگست 1938 کو آزادی سے پہلے کے ہندوستانی شہر لاہور کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں قصور میں ہوئی۔ گھر کا ماحول بڑا تہذیبی تھا۔ آس پاس کے علاقوں میں ان کے آباؤ اجداد کی بڑی عزت تھی۔ خاندان میں زیادہ تر افراد تعلیم سے جڑے ہوئے تھے۔ بچپن سے ہی انہیں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ اور کارٹون بنانے کا بھی شوق تھا۔ اڑتی ہوئی چڑیا، درختوں کی ٹہنیوں پر چہچہاتے پرندے، اچھلتے کودتے جانور دیکھ کر ان کا دل مچل جاتا۔ اسکول میں ڈرائنگ کے مقابلوں میں حصہ لے کر انہوں نے کئی انعام جیتے۔ اس طرح بچپن کا یہ شوق نوجوانی میں بھی پروان چڑھتا گیا ہائی اسکول کی تعلیم پوری کرنے کے بعد انھوں نے ممبئی کے جے جے اسکول آف آرٹس میں داخلہ لیا اور ایک لائق مصور اور کارٹونسٹ کی حیثیت سے وہ پورے علاقہ میں مشہور ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاسیات میں بھی بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

دہلی سے شائع ہونے والے اس وقت کے کثیر الاشاعت اردو اخبار 'ملاپ' میں انہیں کارٹونسٹ کی ایک چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ اسی اخبار سے انہوں نے اپنا پہلا مزاحیہ کردار 'ڈھبو' کی تخلیق کی جس نے خوب شہرت حاصل کی۔ 1970 میں دہلی ہی سے شائع ہونے

پران کمار شرما کے چند مشہور کردار

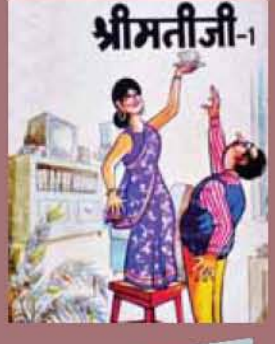

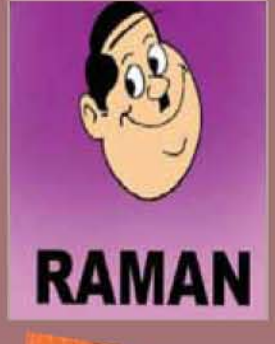

والے کارٹون رسالہ 'لوٹ پوٹ' میں بھی انہوں نے خوب طبع آزمائی کی۔ ہالی وُڈ کی انگریزی مزاحیہ فلموں کے دوموٹے اور پتلے مزاحیہ کرداروں لاریل اور ہارڈی کے مقابلہ میں انہوں نے موٹو اور پتلو کے دوکردار تشکیل دیے جنھوں نے کامکس کی دنیا میں دھوم مچا دی۔ 'لوٹ پوٹ' کے ہر شمارے میں ان کرداروں کی احمقانہ حرکتوں سے پڑھنے والوں کو خوب مزا آتا تھا۔ ان کرداروں کی دلچسپ باتیں پڑھ کر قارئین پران کو تعریفی خطوط لکھتے تھے۔ 1975 کے دوران عام ہندوستانی کی عکاسی کے لیے، مشہور امریکی کامکس کرداروں فینٹم اور سوپرمین کے مقابلہ میں انھوں نے چاچا چودھری کے کردار کی تخلیق کی جو روز مرہ کی زندگی کے کئی مسائل کو چٹکی میں حل کر دیتا ہے۔ چاچا چودھری کا یہ جملہ ''میرا دماغ کمپیوٹر سے بھی زیادہ تیز چلتا ہے۔'' برسوں تک شائقین کو یاد رہے گا۔ اس کے علاوہ پنکی، راکا، شریمتی جی، چتی چاچی، سابو، بلو، وغیرہ کرداروں نے بھی خوب شہرت حاصل کی۔ ہندو، مسلم اور سکھ ان تین دوستوں کے کردار، 'رمن ہم ایک ہیں' کے کارنامے پڑھ کر تو اس وقت کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی بھی خوب متاثر ہوئی تھیں۔ ورلڈ انسائیکلو پیڈیا کے ایڈیٹر نے انھیں 'والٹ ڈزنی آف انڈیا' کے خطاب سے نوازا۔ ملک بھر کے مختلف زبانوں کے 35 سے زائد اخباروں میں ان کے کارٹون شائع ہوتے تھے۔ 1981 میں انھوں نے ملک کے مشہور اشاعت گھر، ڈائمنڈ پاکٹ بکس پبلی کیشن سے رابطہ قائم کیا اور 35 برس تک اسی ادارہ سے وابستہ رہے۔ اس دوران ان کا نام 'لمکا بک آف ورلڈ ریکارڈ' میں بھی درج ہوا۔ 1997 میں انھیں دلی کا سب سے بڑا اعزاز 'راجدھانی رتن ایوارڈ' عطا کیا گیا۔ 2001 میں انھیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ ملا۔ پانچ دہائیوں سے زیادہ عرصے تک انھوں نے کارٹون نگاری کے فن کی خدمت کی اور 6 اگست 2014 کو 75 برس کی عمر میں اس دنیا کو الوداع کہہ گئے۔ بچو، پران صاحب کے کارٹون غور سے پڑھ کر اور کارٹون بنانے کے فن میں دل چسپی لے کر تم بھی اس فن میں آگے چل کر خوب نام کما سکتے ہو، اور مالی منافع بھی اس میں کافی ہے۔ □

Mohd Mubashshir Naved
B N College of Engineering , PUSAD
Distt. Yavatmal - 445215 MS

□ حسین الحق

ایمانداری کا پھل

کہانی

جناب حسین الحق اردو کے اُن تھوڑے سے کہانی کاروں میں ہیں جن کے افسانوں کی دھوم پوری اردو دنیا میں ہے اور جن کی کہانیوں کا لوگ بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ لیکن وہ صرف بڑوں کے لیے لکھتے ہیں، بچوں کے لیے نہیں۔ ہماری پرزور درخواست پر انھوں نے اپنی پہلی کہانی بھیجی ہے جو اس وقت لکھی گئی جب وہ صرف دس سال کے تھے اور یہ کہیں چھپی بھی نہیں۔ اب پچپن برس بعد یہ پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔ حسین الحق صاحب کی تحریر کا عکس بھی ہم ساتھ میں دے رہے ہیں۔ دوسری کہانی بچوں کے لیے وہ کب لکھیں گے یہ ہم نہیں جانتے۔ مگر یہ بات ان سے آپ کو ضرور پوچھنی چاہیے۔ اعزازی مدیر

کسی زمانے میں ایک لوہار تھا۔ اس کا گھر ایک پہاڑی کے سامنے تھا، اسے خدا نے دو لڑکے اور ایک لڑکی دی تھی۔ وہ بہت سخت کام کرتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار پڑ گیا۔ اس کی لڑکی سوسن نے اس کا بہت علاج کیا مگر وہ نہ بچ سکا اور مر گیا۔

یہ وقت سوسن کے لیے بہت ہی سخت تھا، لیکن سوسن نے سوچا کہ اس کو کوئی نہ کوئی کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ بہت دیر سوچنے کے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی ماں سے رفو کرنا سیکھا تھا، کیوں نہ وہ رفو کرنا شروع کر دے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس نے اپنی پڑوسن سے کہا کہ اگر کسی کو رفو کرانا ہو تو وہ اسے اس کے پاس لے آئے۔ لیکن پڑوسن نے اس کو بچہ سمجھ کر اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مگر پڑوسن کے شوہر نے اس کی یہ بات سن لی۔ اُس نے اسی وقت اپنی ایک قمیص لا کر اس کو دی، جس کو سوسن نے بڑی خوبصورتی سے رفو کیا۔

اس کے بعد شہر میں اس کی شہرت ہوتی گئی، اور بڑے بڑے امیر لوگ اس کے پاس پانے کپڑے رفو کرنے کے لیے دینے لگے۔ اور چونکہ وہ بڑے صفائی کے ساتھ رفو کرتی تھی اس لیے امیر لوگ اس کو انعام بھی دیا کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے گھر میں پھر رونق آنے لگی۔

لیکن کبھی کبھی اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اس دنیا میں بالکل اکیلی ہے۔ وہ اپنے باپ کو یاد کر کے بعض وقت بہت روتی تھی۔ مگر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ اس کا غم بھی مدھم ہوتا گیا۔ دوسری طرف شہر میں اس کی شہرت بھی بڑھتی گئی اور ساتھ ہی اس کی ایمانداری کا چرچا بھی خوب ہونے لگا۔

ایسا اس لیے ہوا کیونکہ ایک مرتبہ ایک امیر آدمی نے ایک قمیص اسے رفو کرنے کو دی، جب قمیص رفو کرنے کے لئے سوسن بیٹھی اور قمیص ہاتھ میں لی تو وہ اسے بھاری معلوم ہوئی، جب اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ قمیص میں ایک ایک ہزار کے کئی نوٹ ہیں، لیکن سوسن نے اس کو اسی طرح رکھ دیا۔

ابھی سوسن نے روپیہ جیب میں رکھا ہی تھا کہ وہ امیر آدمی گھبرایا ہوا آیا اور اپنی قمیص مانگی، پھر قمیص میں اپنا روپیہ دیکھ لیا تو اسے اطمینان ہوا۔

سوسن نے اس آدمی سے کہا کہ میں نے یہ روپیہ دیکھ لیا تھا مگر میں نے صرف دیکھ کر جیب میں رکھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر میں اس کی ایمانداری کا اور شہرہ ہوگیا۔

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ایک رات، سوسن کچھ کپڑے رفو کر رہی تھی۔ گھر کا دروازہ بند تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی، سوسن نے جاکر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک بونے قد کا آدمی دروازے پر ایک کپڑا لیے کھڑا ہے۔

''کیا کام ہے؟'' سوسن نے پوچھا۔

''ایک قمیص رفو کرانی ہے۔'' اس نے کہا اور یہ بھی کہا کہ ''میں کل پھر اسی وقت یہاں آؤں گا۔''

سوسن نے وہ قمیض لے لی۔ دوسرے دن اپنے کہنے کے مطابق وہ بونا آدمی رات میں آیا، سوسن نے اس کو قمیص دے دی۔ قمیص کا دینا تھا کہ وہ تیر کی طرح بھاگا۔ سوسن نے یہ دیکھا تو چلانے لگی، لیکن جب اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا تو وہ بھی اس کے پیچھے بھاگی۔ بونا سوسن کے گھر کے سامنے

جو پہاڑی تھی اس پر چڑھ گیا۔ سوسن بھی اس پہاڑی پر چڑھی، وہ تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ اس نے ایک زنگ آلود کنجی پہاڑی پر پڑی ہوئی دیکھی۔

سوسن جیسے ہی کنجی کے پاس پہنچی، کنجی چلائی، ''مجھے اٹھالو۔ مجھے اٹھالو۔''

سوسن پہلے تو جھجکی لیکن کنجی پھر چلائی تو سوسن نے اسے اٹھالیا۔ کنجی کے اٹھانے کے بعد وہ بونا پھر چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ بونا آدمی ایک غار میں گھس گیا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

ابھی سوسن سوچ ہی رہی تھی کہ غار میں اترے یا نہ اترے کہ کنجی پھر چلائی ''غار میں چلو، غار میں چلو۔''

سوسن کنجی کے کہنے پر غار میں اتر گئی۔ غار میں اترنے کے بعد اس نے ایک صندوق دیکھا۔ جب سوسن صندوق کے پاس پہنچی تو وہ بونا آدمی غائب ہوگیا، لیکن اس وقت سوسن کو اس آدمی کا خیال نہیں تھا۔ وہ تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ یہ صندوق کیسا ہے؟ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کنجی پھر چلانے لگی ''مجھے صندوق میں لگادو۔ مجھے صندوق میں لگادو''

سوسن نے کنجی کے کہنے کے مطابق اسے صندوق میں لگادیا۔ صندوق میں کنجی کا لگانا تھا کہ صندوق کھل گیا اور صندوق کے کھلتے ہی وہ غار ہیروں اور جواہرات کی روشنی سے منور ہوگیا۔ اس وقت اس بونے آدمی کی آواز آئی۔ ''سوسن تم اپنی اجرت لے لو۔'' سوسن نے اپنی اجرت لے لی اور اجرت سے ایک پیسہ فاضل نہیں لیا۔

اس بونے آدمی کی پھر آواز آئی ''سوسن چونکہ تم نے ایمانداری سے کام لیا ہے اس لیے تم اس روپے کو جتنا خرچ کروگی، اتنا زیادہ ہوتا جائے گا۔''

سوسن خوشی خوشی روپیہ لے کر گھر لوٹی۔ اس کے بعد اُس کا شمار شہر کے امیر ترین لوگوں میں ہونے لگا۔ لیکن سوسن نے کبھی رفو کرنا نہ چھوڑا کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی شہرت کی وجہ صرف رفوگری ہے اور وہ پہاڑی۔

یہ کہانی سچی ہو یا جھوٹی، لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ ایمان داری سب سے بڑا جوہر ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی جوہر نہیں۔ □

Prof Hussain ul Haq
Sirsyed Colony, New Kareem Ganj Gaya - 823001 Bihar

کہانی

قہقہوں کا لباس

□ سید لطف اللہ

کافی کارنر میں آج بھی کافی چہل پہل تھی۔ سفید اور بے داغ وردیوں والے خوش مزاج بیرے پھرتی سے سرد کر رہے تھے۔ اکثر کسی میز سے کوئی قہقہہ کھنکتا اور آہستہ آہستہ کانوں کے قریب راز دارانہ باتیں کرنے والوں کو تیز بولنے کی دعوت دے کر کہیں گم ہو جاتا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ ایک گوشے میں مجھے ایک بالکل خالی میز مل گئی۔ میں نے میز کے نیچے سے ایک کرسی کھینچی اور اس پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے اوپر نظر پڑتے ہی ایک بیرا تیزی سے میری طرف آیا۔ میں بیرے کو آرڈر دیتے دیتے رک گیا، کیونکہ ایک میز پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ ایک ساتھ جی کھول کر ہنسے تھے۔ مجھے بہت غصہ آیا، لیکن میرے دانتوں نے میرے ہونٹوں کو دبا لیا۔

بیرا میرا آرڈر لے کر چلا گیا۔ ایک لمحہ میں اپنی نظروں کو چاروں طرف پھینک کر میں نے ساری میزوں کا بغور جائزہ لیا اور اس وقت میری آنکھیں جھپک گئیں، جب میں نے اشرف کو اس میز پر دیکھا، جس پر سے ابھی کچھ دیر پہلے ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا تھا اور مجھے اپنے ہونٹوں کو اپنے دانتوں سے دبا کر اپنے غصہ کو سرد کرنا پڑا تھا۔ اشرف؟

اس کافی کارنر میں جہاں لوگ تیز تیز گفتگو کرنے، سیاسی بحثوں میں الجھنے یا لطیفے وغیرہ سنا کر قہقہے لگانے آتے ہیں، میں اپنی تنہائی اور اداسی لے کر آیا تھا، لیکن اشرف؟ وہ کتنا خوش ہے۔ اسے میرے غم سے کیا مطلب؟ جیسے اس کے حصے کے غم کا پیالہ بھی میں ہی پی گیا ہوں۔ ہاں یہ وہی اشرف ہے جو اس وقت بھی مجھ سے حاصل کیے ہوئے سوٹ میں ملبوس ہے۔

میری میز پر آملیٹ کی پلیٹ اور کافی کی پیالی آگئی تھی، جس پر ایک ایسے بوڑھے فلاسفر کی تصویر بنی ہوئی تھی، جو ایک مجمع کو خطاب کر رہا تھا۔ پیالی سے گرم گرم بھانپ کی نازک لکیریں اٹھ رہی تھیں۔ میں ایک لمحے کے لیے اپنا غم بھول گیا اور سوچنے لگا کہ کاش میں بھی ایک بوڑھا فلاسفر ہوتا اور اسی طرح کسی مجمع کو خطاب کر رہا ہوتا۔

میں نے تازہ اور خوشبودار کافی کے تین چار گھونٹ لیے اور پھر پہلو بدل کر ساری میزوں کو باری باری دیکھا۔ ایک میز پر کچھ طلبا کرکٹ میچ کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، نیلی آنکھوں والی ایک لڑکی اس گفتگو میں پیش پیش تھی۔ قریب ہی چند سکھ نوجوان کسی مشین کی ناکامی کی وجہ بتانے میں مصروف تھے۔ اس سے ہٹ کر کچھ لوگ چین کی دست درازیوں پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ دوسری طرف بیٹھے ہوئے لوگ دفتری باتوں کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو کر ہی نہیں سکتے تھے اور پھر اسی میز کے پہلو میں وہ میز تھی، جس پر اشرف اپنے واقف کاروں کو لطیفے سنا رہا تھا۔ میں نے ذرا ادھر کان لگائے۔ وہ کہہ رہا تھا ایک شوہر نے اپنی بیوی سے کہا "بیگم آج ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ بیگم نے پوچھا، کیوں، کیا گھر کا کھانا پسند نہیں؟ شوہر نے جواب دیا نہیں یہ بات نہیں۔ کھانا تو بہت پسند ہے، مگر روز روز برتن دھوتے دھوتے تھک گیا ہوں۔" اس لطیفے پر اشرف کی میز کے لوگ پھر ہنسے۔ مجھے بھی بے اختیار ہنسی آئی مگر میں بالکل نہیں ہنسا۔ میں اس کے لطیفے پر کیسے ہنس سکتا تھا، جو میرے ٹکڑوں پر پل رہا تھا۔

اشرف جس کی آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، ایک سرکاری ملازم تھا۔ وہ ایک غبن کے کیس میں نوکری سے علیحدہ کیا جا چکا تھا اور آج کل بالکل بے کار تھا۔ اس کے گھر میں اس کی بیوہ ماں تھی اور بیوی پہلے ہی میکے جا چکی تھی۔ اس کے ان برے دنوں میں میں نے اس کا ساتھ بالکل نہیں چھوڑا تھا۔ آخر وہ میرا بچپن کا دوست اور ہمراز تھا۔ میں برابر اس کی مدد کر رہا تھا اور آج بھی اس کافی ہاؤس میں آنے سے کچھ گھنٹے قبل میرے پاس آیا تھا اور یہ کہہ کر کہ آج میرے گھر فاقہ ہو گیا ہے، مجھ سے پچاس

روپے مانگ کر لے گیا تھا۔ فاقے کی بات کرنے والا اشرف کافی ہاؤس کی تیز روشنیوں میں اپنے واقف کاروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور میں ایک مسکراہٹ کے لیے ترس رہا تھا۔ لیکن اشرف؟ وہ کتنا خوش ہے! وہ آج تک مجھے دھوکا دیتا رہا ہے۔ میں انگاروں پر لوٹ گیا۔ اس کے واقف کار ماحول سے بے نیاز ہو کر پھر ہنسے۔ شاید اس بار اس نے پہلے سے زیادہ زوردار لطیفہ سنایا تھا۔ میں نے اسے بھی ہنستے دیکھا۔ میری رگیں تن گئیں۔ میں نے فوراً بل منگوایا۔ پیسے ادا کیے اور اشرف کی میز کے قریب سے یہ کہتے ہوئے گذر گیا کہ میرے گھر آج

فاقہ ہوگیا ہے۔ میرا یہ جملہ کسی بم کی طرح پھٹا اور اشرف کی میز پر کبھی نہ ختم ہونے والا سناٹا چھوڑ گیا۔

اپنی رہائش گاہ پر پہنچنے کے ایک گھنٹہ بعد مجھے اشرف کا فون ملا۔ وہ کہہ رہا تھا ”دوست! میرے اوپر تمہارے بڑے احسانات ہیں۔ ایک احسان کرو، مجھ سے ابھی اور اسی وقت ملو، میرے گھر پر، بہت ضروری بات ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے جلدی کرو، یہ میری آخری کال ہے۔ فوراً آؤ۔“ اتنا کہہ اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

ضروری بات؟ اس کے گھر پر؟ وہ بھی ابھی اور اسی وقت؟ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اور نہ چاہتے ہوئے بھی معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے میں اس کے گھر کی طرف نکل پڑا۔

اشرف اپنے باہری کمرے میں چارپائی پر پڑا مجھے مل گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا منہ اور آنکھیں ایک ساتھ پھیل گئے۔ اس کی سرخ سرخ خوفناک آنکھیں نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ میں سہم گیا۔ ”اشرف؟“

”آہستہ بولو“ وہ جیسے بہت دور سے بولا، ”اندر میری ماں، جو کھانا بنا کر میرا انتظار کررہی ہوگی، سن نہ لے۔ میں نے ایک بہت تیز قسم کا زہر پی رکھا ہے۔ میری موت اپنے بڑے بڑے بھاری پنکھ ہلاتی ہوئی میرے طرف آرہی ہے اور ابھی چند لمحوں بعد مجھے افق کے اس پار کہکشاں سے پرے نہ جانے کس دنیا میں لے جائے گی۔ میں ابھی مرجاؤں گا، لیکن ٹھہرو مجھے کہنے دو، میں آج تک جن قہقہوں کے سہارے جیتا رہا، آج تم نے بہت سے لوگوں کے درمیان ان ہی قہقہوں کا لباس نوچ لیا۔ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ اُف ۔۔۔ آہ! ضروری نہیں کہ جو قہقہہ ہم لگائیں، اس کی جڑ میں خوشیاں ہی چھپی ہوں۔ ضروری نہیں کہ جو مسکراہٹ ہمارے ہونٹوں پر ہے وہ دل ہی سے نکلی ہو۔ ضروری نہیں کہ جب ہم خوشی کے گیت گارہے ہوں تو غم کے گیتوں سے ہمارا تعلق نہ ہو، مگر آہ، اف! زہر کا اثر اب اور تیز ہوگیا ہے۔ بدن کا جوڑ جوڑ الگ ہورہا ہے۔ یہ آواز کیسی ہے؟ یہ دستک کون دے رہا ہے؟ ہاں شاید زندگی کے دروازے پر موت آکھڑی ہوئی ہے۔ خیر اسے آنے دو، میں جاؤں گا، میں جارہا ہوں، میں، ہاں! ہاں! میرا قہقہوں کا لباس تم نے اتار لیا ہے۔۔۔“

میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے، اس کی آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ڈوب چکی تھی۔ میں نے چپکے سے اس کے کمرے سے نکل جانا چاہا۔ مگر یہ کیا۔ دروازے میں اشرف کی بوڑھی ماں کھڑی ہوئی تھی۔ میں لرز گیا اس کی آنکھیں نہیں جھپک رہی تھیں اور وہ ایک ٹک مجھے دیکھے جارہی تھی، جیسے صدیوں سے اسی طرح دیکھ رہی ہو۔ اور پہچان رہی ہو۔ اور جب تک مجھے پہچان نہیں لیتی اسی طرح مجھے دیکھتی رہے گی۔ اور میں؟ اسی طرح کھڑا رہوں گا۔ خاموش، بے جان۔ اور کسی بت کی طرح بے زبان!! □

Syed Lutfullah
Sangi Maajid, Shaikhpur, GorakhpurUP-273005

□ سلطان احمد اشک

بھاگ لالہ بھاگ جھونپڑی آئی

بہت پرانے زمانے کی بات ہے، کسی گاؤں میں ایک ساہوکار رہا کرتا تھا، وہ بڑا ہی لالچی اور مکار قسم کا انسان تھا۔ پورے گاؤں کی زمین وہ اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا، اور اس نے گاؤں کے سبھی غریب کسانوں کی زمین کسی نہ کسی بہانے اپنے قبضے میں کر ہی لی تھی۔ صرف رامو کی ایک جھونپڑی اور اس کی زمین کو چھوڑ کر، کیوں کہ رامو ایک بڑا ہی محنتی کسان تھا۔ لیکن ساہوکار بھی کوئی کم چالاک نہیں تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش میں رہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح رامو کو اپنے جال میں پھانس لے۔ پھر ایک سال ایسا ہوا کہ بارش نہ ہونے کی وجہ سے رامو کی ساری فصلیں سوکھ گئیں اور سارا گاؤں قحط میں مبتلا ہو گیا۔ مجبوراً رامو کو بھی ساہوکار کے پاس قرض لینے کے لیے جانا پڑا۔ ساہوکار رامو کو دیکھ کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور پھر اس نے کہا "دیکھو رامو! آج کل میں نے قرض دینا بند کر دیا ہے، لیکن تم میرے اچھے پڑوسی ہو اس لیے میں تمہیں کچھ روپے ادھار دے سکتا ہوں، پر میری ایک شرط ہے۔"

''شرط... کیسی شرط؟'' رامو نے پوچھا۔

''تمہیں اپنی جھونپڑی میرے پاس گروی رکھنی ہوگی۔'' ساہوکار نے کہا۔'' اگر پانچ مہینے میں تم میرے روپے واپس نہ کر پائے تو تمہاری جھونپڑی میری ہوجائے گی۔''

رامو کچھ سوچ میں پڑ گیا۔لیکن مجبوری کے کارن ساہوکار کی یہ شرط ماننی پڑی، اور اس نے قرض لے لیا۔ رامو کی جھونپڑی کے سامنے ایک بہت پرانا پیپل کا پیڑ تھا۔اس پیڑ سے رامو کو بہت محبت تھی۔ وہ روز اسے ایک لوٹا پانی اور بتاشا چڑھایا کرتا تھا۔اس پیڑ پر ایک جادوگر کا بھوت رہا کرتا تھا، جو اس بتاشے کو کھالیا کرتا تھا۔اس وجہ سے رامو سے وہ بہت خوش رہتا تھا۔

دھیرے دھیرے پانچ ماہ کا وقت گذرتا گیا اور رامو اپنے وعدے کے مطابق ساہوکار کا قرض واپس کرنہ سکا۔ ادھر ساہوکار وقت ختم ہوتے ہی جھونپڑی پر اپنا قبضہ جمانے آدھمکا۔ رامو بہت رویا گڑگڑایا لیکن ساہوکار پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ گاؤں والوں کے بہت کہنے سننے پر اس نے مشکل سے صرف ایک رات رہنے کی اجازت دے دی۔ پوری رات رامو اور اس کی بیوی روتے رہے۔ان کے آنسو دیکھ کر جادوگر کے بھوت کا دل پسیج گیا اور اس نے رات کو پیپل کے پیڑ کے نیچے روپیوں سے بھرا ایک تھیلا رکھ دیا۔

اگلی صبح آخری کار رامو پانی اور بتاشا لے کر چڑھانے آیا تو روپے سے بھرا تھیلا دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا اور خوشی سے اچھل پڑا ۔پھر فوراً اپنی بیوی کو بلایا اور کہنے لگا ''شاید اوپر والے سے ہماری پریشانی اور مصیبت دیکھی نہ گئی اور اس نے اس طرح میری مدد کی ہے۔''

رامو کی بیوی آنسو بھری نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی ''اب ہمیں جھونپڑی سے کوئی نہیں نکال سکتا۔''

تبھی ساہوکار وہاں آگیا اور بولا'' کیوں نہیں نکال سکتا؟ یہ نیک کام تو میں ہی کروں گا۔''

ساہوکار کو دیکھ رامو نے روپے کی تھیلی اس کی طرف بڑھادی اور

کہا ''سرکار اس میں سے سود سمیت آپ اپنے روپے لے لیں اور باقی مجھے واپس کر دیں۔''

رامو کے پاس روپے کی تھیلی دیکھ کر ساہوکار کو بڑا تعجب ہوا اور اسے اپنے کیے کرائے پر پانی پھرتا ہوا نظر آنے لگا۔ پھر وہ بڑی چالاکی سے اکڑتا ہوا بولا ''شرط کے مطابق یہ جھونپڑی کل ہی ہماری ہوگئی تھی۔ میں تو تمہیں صرف ایک رات گذارنے کی اجازت دی تھی۔ اب تم اسے فوراً خالی کرو۔''

''سیٹھ جی آپ تو اتنے بڑے آدمی ہیں، مجھ غریب کی جھونپڑی لے کر آپ کو کیا ملے گا۔ آپ اپنے روپے لے لیجیے اور میری جھونپڑی چھوڑ دیجیے۔ رامو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

مگر ساہوکار ٹس سے مس نہ ہوا۔ کہنے لگا ''میں تو جھونپڑی ہی لوں گا!'' ساہوکار اپنی ضد پر اڑا تھا رامو اور اس کی بیوی بہت روئے گڑگڑائے لیکن ساہوکار پر کوئی اثر نہ ہوا۔

رامو نے تنگ آکر جھنجھلاتے ہوئے کہا ''آپ اس جھونپڑی کے پیچھے اس طرح پڑے ہیں جیسے آپ جہاں بھی جائیں گے، جھونپڑی کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔''

''ہاں میں جہاں بھی جاؤں گا اس جھونپڑی کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔'' ساہوکار نے چیخ کر کہا۔ مایوس ہوکر رامو اور اس کی بیوی نے روتے بلکتے جھونپڑی خالی کر دی۔ جادوگر بھوت سے ان کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور اس نے ساہوکار کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا۔

رامو کے جانے کے بعد ساہوکار جیت کی خوشی میں اپنی حویلی کی طرف چل پڑا۔ تبھی اسے اپنے پیچھے کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی اور جیسے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا تو چونک پڑا۔ رامو کی جھونپڑی کچھ قدم آگے کھسک چکی تھی۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ سوچتے ساہوکار آگے بڑھا۔ پھر آہٹ ملنے پر اس نے دوبارہ پیچھے مڑکر کر دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیونکہ رامو کی جھونپڑی اب سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر ساہوکار گھبرا گیا اور دوڑ کر اپنے حویلی میں گھس گیا۔ رامو کی جھونپڑی بھی اس کے حویلی کے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔

اس حیرت انگیز واقعے کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی اور جھونپڑی کو دیکھنے کے لیے گاؤں والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ڈر کے مارے ساہوکار حویلی میں ہی چھپا رہا۔ کسی طرح سے اسے سمجھا بجھا کر حویلی کے پیچھے والے راستے سے باہر نکالا گیا۔ ابھی وہ لوگوں سے ساری باتیں بتا ہی رہا تھا کہ جھونپڑی وہاں بھی پہنچ گئی۔ ساہوکار ڈر سے کانپنے لگا۔

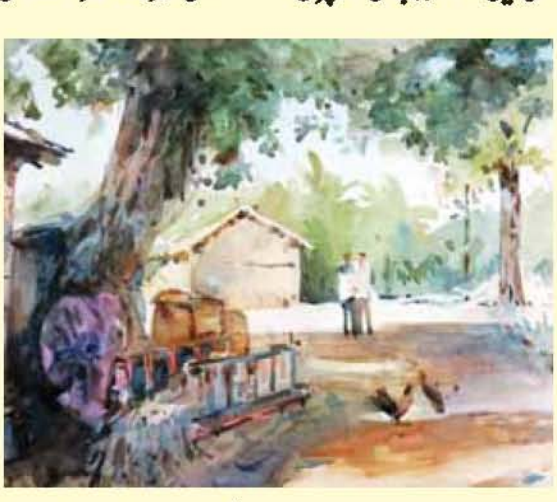

تب کسی نے اسے گاؤں کے باہر ایک مندر میں رہنے والے ایک مہاتما کے پاس جانے کی صلاح دی۔ گرتا پڑتا ساہوکار مندر کی طرف چل پڑا۔ جھونپڑی بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ وہاں پہنچ کر ساہوکار مہاتما جی کے پیروں پر گر کر رونے لگا اور ساری باتیں بتائیں۔ مہاتما بہت پہنچا ہوا ایک درویش قسم کا آدمی تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے پتہ لگایا تو ساری باتیں سمجھ میں آگئیں۔ پھر اپنی آنکھیں کھول کر ساہوکار سے بولا ''جھونپڑی تو آپ کے حکم کی اطاعت کر رہی ہے۔''

''میرے حکم کی؟'' ساہوکار مہاتما کی باتیں سن کر چونک پڑا۔

''ہاں! آپ نے ہی تو رامو سے کہا تھا کہ آپ جہاں جائیں گے جھونپڑی کو ساتھ لے کر جائیں گے۔ بس اسی لیے وہ آپ کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔'' مہاتما نے ساہوکار کو اس کی کہی ہوئی باتیں یاد دلائیں۔ تب

ساہوکار کو لگا کہ ضرور رامو کوئی جادو ٹونا جانتا ہے۔ اسی لیے جھونپڑی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے مہاتما سے کہا ''مہاراج اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی کوئی ترکیب بتایئے۔''

مہاتما نے پھر آنکھیں بند کیں اور اپنی پوری طاقت لگا کر جادوگر کے بھوت کو اپنے پاس بلالیا۔ جب مہاتما نے اس سے بات کی تو وہ بولا ''اگر یہ لالچی ساہوکار اپنے سارے بہی کھاتے جو اس نے دھوکے سے اکٹھے کیے ہیں۔ جلادے تو میں اس کا پیچھا چھوڑ دوں گا۔''

انہوں نے جب یہ باتیں ساہوکار کو بتائیں تو اس نے یہ شرط ماننے سے انکار کردیا۔ تب مہاتما نے کہا ''پھر میں آپ کی کچھ بھی مدد نہیں کرسکتا۔''

ساہوکار مایوس ہوکر اپنی حویلی کی طرف چل پڑا۔ رامو کی جھونپڑی بھی پہلے کی طرح اس کے پیچھے چل پڑی۔ کچھ ہی دنوں میں ساہوکار کا برا حال ہوگیا۔ وہ جہاں بھی جاتا رامو کی جھونپڑی اس کا پیچھا کرتی رہتی۔ اب تو گاؤں کے بچے بھی اسے دیکھتے ہی کہنے لگتے:

''بھاگ لالہ بھاگ جھونپڑی آئی...''

بے حال ہوکر ساہوکار ایک بار پھر مہاتما کے پاس مدد کے لیے پہنچا۔ مہاتما نے وہی بات دہرائی اور کہا ''اس کا بس یہی ایک اُپائے ہے!''

اور کوئی تدبیر نہ ہونے کی وجہ سے ساہوکار کو یہ بات ماننی پڑی، اور اس طرح اس نے اپنا سارا غلط بہی کھاتا جلا ڈالا۔ بہی کھاتے کے جلتے ہی جھونپڑی اپنی جگہ پہ واپس چلی گئی، اور پھر رامو کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سبھی غریب کسانوں کو ساہوکار کے چنگل سے آزادی ملی اور گاؤں پھر سے خوش حال ہوگیا۔ □

Sultan Ahmed Ashk
Ghagha Ghat KHan Mirza Opp.Hanuman Mandir,
Sultan Ganj PO. Mahendra, Patna-800006 Bihar

کہانی

□ مظہر الاسلام علیگ

شیر اور پنجرہ

شیر نے سرکس کے رنگ ماسٹر کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

رنگ ماسٹر نے تحکمانہ انداز میں کہا ''چل اندر!''

مگر شیر آج فیصلہ کیے ہوئے تھا کہ چاہے آج کتنے بھی ہنٹر کھانے پڑیں، آج آزادی حاصل کرنی ہی ہے۔

ماسٹر نے زمین پر ہنٹر پٹخا اور پھر حکم دہرایا ''چل اندر'' مگر یہ کیا؟ شیر نے چھلانگ لگائی اور چھولداری سے نکل کر جنگل کی راہ لی۔

منیجر نے رنگ ماسٹر کو پھٹکار لگائی، ''کیوں؟ کیا خوراک پوری نہیں دی تھی؟''

رنگ ماسٹر نے ہکلاتے ہوئے کہا ''بب... باس... کیا بتاؤں، میری زندگی کا یہ پہلا واقعہ ہے کہ شیر نے اس طرح حکم عدولی کی ہو۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔''

''اب میری شکل کیا دیکھتے ہو، پنجرہ ٹرالی پر لگاؤ، جیپ دوڑاؤ، ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ عام شہریوں کی زندگی کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔ بڑی مصیبت کھڑی کر دی ہے تم نے۔'' منیجر چلایا۔

رنگ ماسٹر نے دو بندوق بردار اپنے ہمراہ لیے اور جیپ تیزی سے دوڑادی۔ اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا مگر بے سود۔ تین دن بعد اطلاع ملی کہ فلاں شہر میں ایک شیر دیکھا گیا ہے جس کی گردن میں پٹہ پڑا ہے۔ ماسٹر نے جیپ اسی طرف دوڑادی اور شیر کو جالیا۔ آمنا سامنا ہوا تو شیر غرّایا۔

''چل ماسٹر چل... کیوں میرے پیٹ پر لات مارتا ہے!'' رنگ ماسٹر نے شیر سے التجا کی۔

شیر دہاڑا: ''کیوں آج یہ خوشامدی انداز کیوں؟ روز تو حکم چلاتا تھا، مجھے بھوکا رکھا، مجھ پر کوڑے برسائے۔ جب تو نے میری آزادی چھینی، تب تجھے احساس نہ ہوا؟''

''تو سمجھ نہیں رہا... میں نے تجھ پر احسان کیا۔ شکاریوں سے تیری جان بچائی، ورنہ کوئی بھی تجھے گولیوں کا نشانہ بنادیتا۔'' رنگ ماسٹر نے کہا۔

شیر مسکرایا۔ ''آج میری باری ہے تو کیسا پسینہ چھوٹ رہا ہے۔''

رنگ ماسٹر کا رنگ اڑ گیا۔ پسینہ پونچھتے ہوئے بولا ''اچھا کسی سے فیصلہ کرالو... میں نے تم سے وفا کی یا تم نے بے وفائی کی ہے۔''

شیر ذرا نرم ہوا۔ بولا، ''ٹھیک ہے۔ انسان تو یہاں آس پاس ہے نہیں چلو اس درخت سے فیصلہ کراتے ہیں۔''

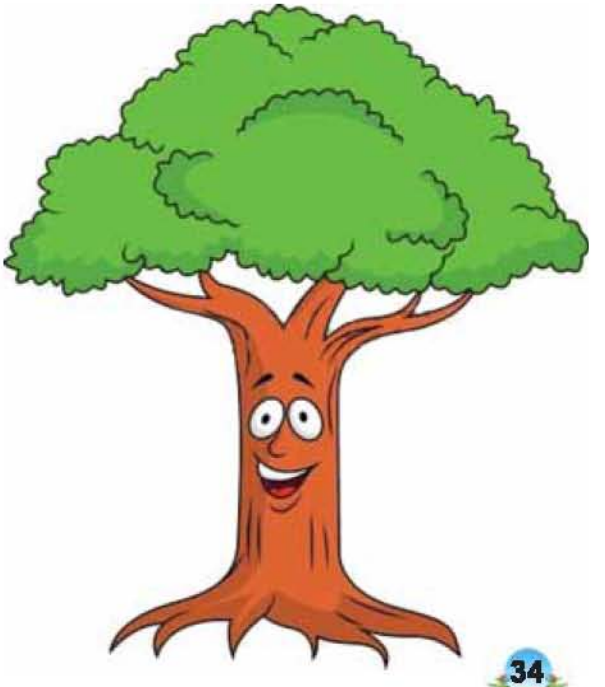

رنگ ماسٹر نے درخت سے کہا ''درخت بتاؤ میں نے اس کی ہر طرح دیکھ بھال کی، ہر طرح کا آرام دیا۔ پھر بھی یہ بھاگ نکلا۔''

درخت نے انسان کو غور سے دیکھا اور بولا ''اوہ! تم اس انسان کی بات کرتے ہو، جس کو میں نے پھل پھول دیے، سایہ دیا، ماحول کی حفاظت کی، مگر اسی نے میری جڑیں کاٹیں۔ مجھ پر کلہاڑی چلائی۔ بڑے بڑے آرے چلوائے۔ سن اے شیر، اس کی سزا یہی ہے کہ تو اس انسان کو مار کر اپنا پیٹ بھر لے۔''

شیر پھر غرایا ''بولو ماسٹر اب کیا کہتے ہو؟''

رنگ ماسٹر پسینہ پسینہ ہوگیا۔ سوچنے لگا کسی طرح سڑک پر کھڑی جیپ تک پہنچ جاؤں، اور اپنی جان بچاؤں۔ وہ بولا ''چلو اس سڑک سے پوچھتے ہیں، یہی فیصلہ کرے گی۔''

دونوں سڑک تک پہنچ گئے۔ رنگ ماسٹر بولا ''سڑک، تم ہی انصاف کرو، اس طرح بھی کوئی گھر سے روٹھتا ہے۔ میں نے اسے دو وقت پیٹ بھر کھانا کھلایا، شکاریوں سے حفاظت کی، بھلا میں احسان فراموش ہوں کہ یہ شیر؟''

سڑک نے دونوں کی باتیں اشتیاق سے سنیں، اور سنجیدہ ہوکر بولی ''واقعی یہ انسان ہے ہی بے وفا، نہ جانے زندگی میں کیا کیا کرتا ہے، میں نے زندگی کی راہ آسان کی۔ اس کو آرام دیا۔ مگر لوگ مجھ پر غلاظت پھینکتے ہیں، عوامی ترقی کے نام پر کدالی چلاتے ہیں۔ کھائیاں کھودتے ہیں۔ پٹرول اور دھوئیں کی بو سے میرا دم گھٹا جاتا ہے۔ تمام کثافت کی جڑ انسان ہے، اس کو تو تم ایسی سزا دو کہ دوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو۔''

یہ سن کر رنگ ماسٹر کا سر چکرا گیا۔ مگر حواس پر قابو پاتے ہوئے

جیپ کی طرف بڑھا۔

شیر نے دہاڑا ''نہ...نہ...زیادہ ہوشیاری دکھانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے، تین دن سے کوئی بھی شکار ہاتھ نہیں لگا۔''

خدا بڑا کارساز ہے، ایک لومڑی کا ادھر سے گذر ہوا۔ راستہ کاٹ کر بھاگنا ہی چاہتی تھی کہ رنگ ماسٹر نے پکارا ''بی لومڑی ذرا تم ہی انصاف کرو، بتاؤ کہ انسان ظالم اور بے وفا ہوتا ہے یا حیوان؟''

شیر نے کہا ''چلو آخری موقع دیتا ہوں، اس سے فیصلہ کرالو، اس کے بعد مہلت نہ دوں گا۔ درخت اور سڑک کا فیصلہ تم سن ہی چکے ہو۔''

لومڑی معاملے کی نزاکت بھانپ گئی بولی ''یہ آدمی تو تمہاری جان پہچان کا لگتا ہے۔''

شیر نے کہا ''برسوں سے...مگر...''

لومڑی سوچتے ہوئے بولی ''مگر معاملہ کیا ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ یہ جان پہچان...اور پھر تکرار...بڑا عجیب لگتا ہے۔''

شیر نے کہا '' سنو! اس نے مجھے پنجرے میں رکھا، کوڑے برسائے، کرتب سکھائے، لوگ خوش ہوتے تھے تب مجھے کھانے کو دیتا تھا، آج مجھے موقع ملا ہے، میں آزادی چاہتا ہوں۔''

لومڑی نے حیرت سے کہا ''پنجرہ؟ وہ کیا ہوتا ہے؟''

شیر نے مزاحیہ انداز میں کہا ''بی لومڑی تو نے آج تک پنجرہ نہیں دیکھا۔ دیکھ وہ رہا، لوہے کی سلاخوں والا...''

''اچھا یہ بتاؤ کہ یہ آدمی پنجرہ میں تھا یا تم؟''

''بے وقوف...آدمی پنجرے میں نہیں رہتے۔ عالیشان مکانوں میں رہتے ہیں۔ پنجرے میں تو میں رہتا تھا...میں! یہ مجھے پنجرے میں بند کرتا تھا۔ پھر نکالتا تھا، پھر ہنٹر مارتا تھا، آہ! آج بھی ہنٹر کے نشان میرے جسم پر مل جائیں گے۔''

''کس طرح رہتے تھے پنجرے۔ کیسے اندر آتے جاتے تھے۔''

''بے وقوف! سٹھیا گئی ہے۔ میں دکھاتا ہوں۔ اس طرح پنجرے میں داخل ہوتے ہیں۔'' یہ کہہ کر شیر نے پنجرے میں چھلانگ لگائی، اور کہا ''اب تو پتہ چل گیا۔''

موقع پا کر رنگ ماسٹر نے پنجرے کا دروازہ بند کیا اور تالا ڈل دیا۔ رنگ ماسٹر نے لومڑی کا شکریہ ادا کیا اور کہا ''بی لومڑی کبھی سرکس

آنا، یہی شیر تمہیں کرتب دکھا کر دل خوش کرے گا۔''

''شکریہ! مجھے سرکس دیکھنے کا شوق نہیں۔'' یہ کہہ کر لومڑی نے اپنی راہ لی اور شیر نے سلاخوں پر پنجہ مار کر دہاڑتے ہوئے کہا ''چالاک لومڑی میں تجھے سمجھ لوں گا۔'' □

Mazharull Islam
31- Baheilman Upar Kot Bulandshaher - 203001 UP

نظم

□ حشمت کمال پاشا

دیکھ رہا ہوں

خوابوں میں بھی اسکول کا در دیکھ رہا ہوں
ایکوام کی آمد کا اثر دیکھ رہا ہوں

'ت' سے لکھوں توتا کہ لکھوں 'ط' سے طوطا
املا کا مگر زیر و زبر دیکھ رہا ہوں

کچھ سخت ہی ایسا ہے کہ پلے نہیں پڑتا
میں اپنا سبق دیر سے سر دیکھ رہا ہوں

کہتا ہے یہ جوتش کر پڑھو ٹھیک سے بیٹا
ریکھا میں پڑھائی کی کسر دیکھ رہا ہوں

دربان چلا ہاتھ میں وہ موگری لے کر
بجنے کو ہے چھٹی کا گجر دیکھ رہا ہوں

بنگال کے بچوں کی ہے یورپ میں تجارت
اخبار میں منحوس خبر دیکھ رہا ہوں

سادھو سا بنا بیٹھا ہے وہ آج جو پاشا
الو کی پٹائی کا اثر دیکھ رہا ہوں

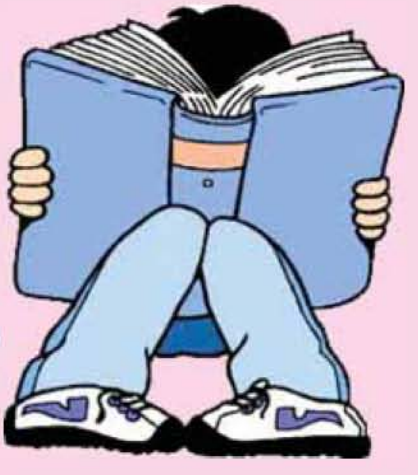

Hashmat Kamal Pasha B-11, NawabWajid Ali Shah Road,
Distt Garden Road, Kolkata - 700024

کامکس اسٹوری

بھولے بھالو کی حماقتیں

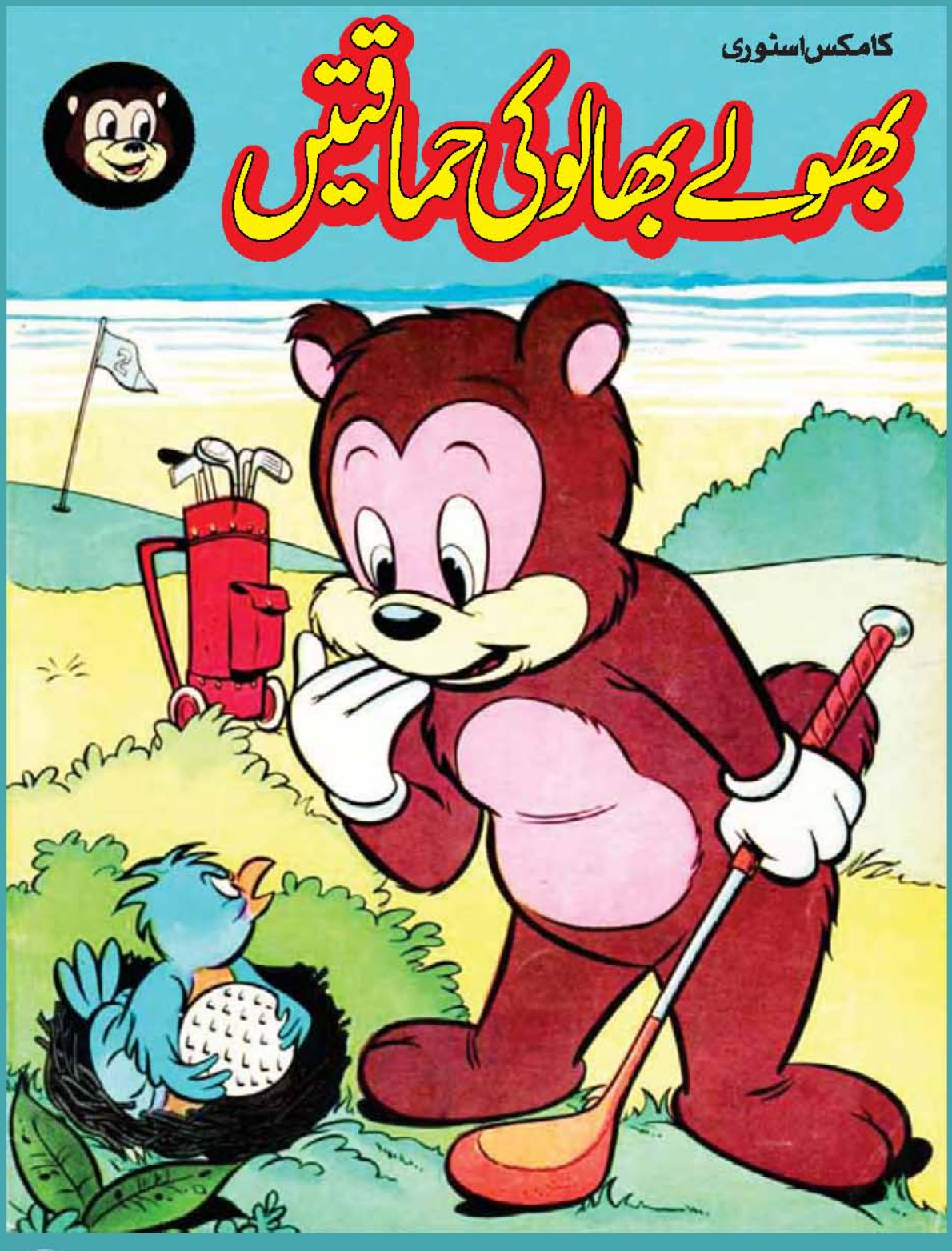

بارش اور ٹپکتا ہوا نل!

لعنت ہے! اِل کی ٹونٹی کو بھی
اسی وقت ٹپکنا تھا!
ٹپ
ٹپ
ٹپ
ٹپ
چلو، تولیہ باندھ کر روکتے ہیں
بلپ!
شڑاپ
ہیلو، بے وقوف لومڑ پلمبر! فوراً یہاں آؤ
اور ٹونٹی ٹھیک کرو
مجھے نفرت ہے اس
لعنتی لومڑے سے
مگر اس خراب موسم
میں اور کون گھر سے
نکلے گا
میں آ گیا بھولے، کون سی
ٹونٹی خراب ہے
اوپر
باتھ روم کی
ارے اُدھر تہہ
خانہ ہے بے
وقوف!
مجھے پتہ ہے۔ نیچے جا کر مین
والو بند کرنا ہے بس!

اووووف!
ٹھن ٹھن پھٹاک
دیکھو! تم نے اپنے سر سے یہ پائپ توڑ دیا ہے
اوہ۔۔۔
فش فش فش
تم فکر نہ کرو بھولے، میں یہ مین والو بند کرتا ہوں پھر دیکھنا سب ٹھیک ہو جائے گا
شرر شرر
غلطی میری ہے تمھیں بلانا ہی نہیں چاہیے تھا، تم نے والو بند کرنے کی بجائے اور کھول دیا ہے
یا خدا، یہ کیسا واٹر سسٹم ہے!
میرا خیال ہے سبق نمبر 14 دوبارہ پڑھنا چاہیے
اف! میں اوپر ایمرجنسی والوں کو فون کرنے جا رہا ہوں۔

ہیلو آپریٹر! مجھے سیلاب کی رپورٹ لکھوانی ہے۔۔۔
غڑپ!
شراپ
اس الو کے پٹھے نے شاید اپنا فون بارش میں رکھ چھوڑا ہے! لگتا ہے آج میں پاگل ہو جاؤں گا
شاید پورا باتھ روم ہی پانی سے بھر گیا ہے!
یوں تو پورا مکان بیٹھ جائے گا
بچاؤ بچاؤ! کوئی مدد کرو ہیلپ پولس! سی بی آئی! فائر سروس!!
ارے نہیں بھئی! بحری فوج کو پکارو

Buster Bear سے ماخوذ/ترجمہ: شبنم پروین

□ حفیظ الرحمٰن انصاری

ٹیمز کے کنارے

گریٹ برٹین یا برطانیہ عظمیٰ اور اس کی راجدھانی لندن کے لیے دریائے ٹیمز اور اس کا ساحل کسی نعمت سے کم نہیں۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ مختلف تہذیبیں دریائی ڈیلٹاؤں کے کنارے پر پھولی پھلی ہیں۔ تقریباً دو ہزار سال پہلے 0043 میں رومن فوجی آلس پلاٹیئس نے لندن بسایا تھا۔

دریائے ٹیمز Thames کے ساحل دنیا کے سب سے خوب صورت دریائی ساحلوں میں گنے جاتے ہیں۔ ان پر موجود تفریح گاہوں کو لاک Lock کہتے ہیں۔ ٹیمز کے 44 لاکس موجود ہیں۔ سیاح اپنی من پسند تفریح گاہوں کا لطف لینے کی خاطر لمبی قطاروں کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ ویسے بھی اس کے آس پاس سیاحتی دل چسپی کی جگہوں Tourist Resorts میں رہنا کافی مہنگا ہے آیئے کچھ خاص مقامات پر چلتے ہیں۔

Walling Ford (ویلنگ فورڈ) :

زمینی اور آبی دونوں راستوں سے اس لاک تک جاسکتے ہیں۔ لیکن قدرتی مناظر اور پرندوں کے غول سے لطف اندوز ہونے کے لئے عموماً سیاح بحری راستے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اگر آپ ٹیوب ریلوے سے سفر کررہے ہوں تو Cholsy Station پر اتر جایئے یہاں سے روڈ نمبر A 4130 آپ کو متعلقہ لاک تک لے آئی گی۔ اپنے مشہور ٹی وی ڈرامہ، لائٹ اینڈ ساؤنڈ شوز مثلاً ٹڈ سمر مرڈرز کے سبب یہ علاقہ نہ صرف برطانیہ بلکہ غیر ممالک میں بھی کافی مقبول ہے۔ قدرتی وسائل، حسین وشاداب

ویلنگ فورڈ کی کچھ سڑکیں اور بازار

کنگسٹن میں ٹیمز کے کنارے بنا ہوا مشہور پل جو دنیا بھر میں ٹیمز اور انگلینڈ دونوں کی پہچان بن چکا ہے

مناظر، دہقانی حسن یہاں کا خاصہ ہیں۔ ویلنگ فورڈ کسی زمانہ میں Sexon Town سے جانا جاتا تھا۔ اولیور کرام ویل دور کے عظیم فاتح، ولیم کا محل اور قلعہ نہ صرف اسکالرز بلکہ ہزارہا سیاحوں کو اپنی جانب راغب کرتا ہے۔ ان کے علاوہ چرچ باغات ہوٹل ریزورٹس گفٹ کارنرز اور کئی منزلہ شاپنگ مالز کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

Lechlade on Thames (لیچلے آن ٹیمز): یہ ایک چھوٹا سا مارکیٹ ٹاؤن ہے۔ جو کسی زمانہ میں اون کی صنعت کا زبردست مرکز تھا۔ وکٹوریائی زمانے کے بادشاہوں کا یہ اب تک کا اہم ترین فشنگ شاپنگ و بوٹنگ سینٹر ہے۔ شاپنگ مالز، گفٹ کارنرس، گیسٹ ہاؤس، آبشاروں باغات پھولوں کے تختے اور ان کے حسن کے علاوہ آکسفرڈ باتھ شلٹن کی قربت نے اس کی شہرت ساتویں آسمان تک پہنچادی ہے۔ سالانہ فلیگ فیسٹی ول کا حسن دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ خاموشی اور روحانی سکون کی تلاش کرنے والے یہاں کے 15 ویں صدی کے تعمیر شدہ، سینٹ لارنس گرجا، اور ان سے منسلک خانقاہوں کا رخ کرتے ہیں۔ نت نئی کلیوں کی پھبن، پرندوں کی چہلیں اور جھرنوں کا حسن اس کی خوب صورتی کو اور بڑھا دیتا ہے۔ اب یہ برطانیہ کا زبردست تعلیمی سیاحتی و کلچرل سنٹر ہے۔ ملک اور باہری ملکوں کے ہزاروں طالب علموں کی وجہ سے اس کی شہرت کو چار چاند لگے۔ آکسفرڈ سے متعلق ایک صحافی اپنے کالم میں یوں لکھتا ہے۔ ''یہاں کا ہر دن نئی دلچسپیوں اور دل بستگی کے سامان ساتھ لے کر آتا ہے۔'' یہاں کا صدیوں پرانا قدیم قلعہ نئی سج دھج کے ساتھ مقبول عوامی تفریح گاہ بن چکا ہے۔ پرانا جیل خانہ اب خوبصورت ہوٹل اور ریزورٹ

لیچلے آن ٹیمز میں موسیقی کا میلہ جو دیکھنے کے ساتھ سننے سے بھی تعلق رکھتا ہے

ٹیمز سے ونڈسر سٹی کا منظر، نیچے دائیں جانب کنگسٹن اپون ٹیمز کے علاقے کا ایک شاپنگ سینٹر، اور اگلے صفحے پر ہینلے اپون ٹیمز کا ایک دل فریب منظر

ہے۔ لیوی کارل کا خوبصورت قلعہ نما محل بھی اب خوبصورت باغ اور میوزیم میں تبدیل ہو جانے کو بے قرار ہے۔

Kingston Upon Thames (کنگسٹن اپون ٹیمز)

اگر آپ نے لندن سے ٹیوب ٹرین پکڑی ہو تو کنگسٹن جاتے وقت مشہور اسٹیشن شہراس ترتیب سے آپ کو ملیں گے ۔ لندن، فلہام، Twichenham ، برنٹ فورڈ، رچمنڈ ، Chiswick ، Barnes

اور کنگسٹن اپون ٹیمز ۔ یہاں سے روڈ نمبر A 238 آپ کو مذکورہ Lock تک لے آتی ہے۔ اسے خوبصورت گفٹ شاپ، شاپنگ مالز، فلاور اینڈ بکے شاپ کا علاقہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں قدیم و جدید تہذیب کا حسین میل جول دیکھا جا سکتا ہے۔ سرے Surray میں تعمیر کردہ قدیم ترین کیٹرن پل آج بھی سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ چارٹر ریکوے ڈیولپرس نے اسے جدت کا لباس پہنا کر دیگر ترقی یافتہ شہروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ سال بھر میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا کہ مسافروں اور سیاحوں کی وجہ سے یہاں جشن کا سا ماحول نہ رہتا ہو۔

Windsor (ونڈسر): دریائے ٹیمز کی پرفضا وادیوں میں بسا یہ شہر برطانیہ و لندن کا Gem کہلاتا ہے۔ موسم گرما کا آغاز ہوتے ہی ملکہ عالیہ (ملکہ الزبتھ) اپنے افراد خانہ اور مصاحبین کے ساتھ ڈیوک آف ونڈسر کے شاہی قلعہ نما محل میں آجاتی ہیں۔ بعض اوقات پورا موسم گرما ان ہی وادیوں میں گذار دیتی ہیں۔ قلب شہر میں ونڈسر کا شاہی محل دور تک پھیلے مرغزار سبز قالینوں سے مزین وادیاں پھولوں سے لدی ڈالیاں اور جھیلیں کوہساروں سے نکلتے قل قل کرتے جھرنے پرندوں کے بسیرے اور چہچہے خوبصورت بوٹس Boats گھیاں شاپنگ مالز، فلاور شاپ ریزورٹ یہاں کی

خاص کشش ہیں ایٹن کالج بھی ہر سال لاکھوں سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے اگر آپ موسم بہار میں کاؤ بوائز اپنے مخصوص لباس اور ساز کے ساتھ گھوڑوں پر سوار اپنے ریوڑ کی نگہبانی کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر آپ بانسری یا الیکٹرک گٹار پر ان سے کوئی دھن سن لیں تو اس کے جادو میں کھو جائیں گے۔

یہاں کی عمارتیں، چرچ، باغات، لینڈ اسکیپ اور دیگر چیزوں کو کینوس پر بکھیرنے کے لیے مصوروں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ بحر حال فطرت کے حسن کے متلاشی اسے کسی جنت سے کم نہیں سمجھتے۔

Henley Upon Thames (ہینلے اپون ٹیمز): یہ علاقہ دیکھنے کے بعد بے ساختہ زبان پر یہ شعر آجاتا ہے کہ 'اگر فردوس بروئے زمیں است، ہمیں است وہمیں است'۔ یعنی:

اگر فردوس دنیا میں کہیں ہے
یہیں پر ہے یہیں پر ہے یہیں ہے

لندن سے سوا گھنٹے کی ٹرین مسافت سے اس لاک تک پہنچا جاسکتا ہے۔ راستہ میں اگر آپ چاہیں تو بریک جرنی کرکے ان مقامات کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ونڈسر، میڈن سیڈ اور مارلو وغیرہ روڈ نمبر A 4130 کے قریب آپ ہینلے کا بھرپور مزہ لے سکتے ہیں۔ یہاں کا دہقانی حسن مرغزار شاداب وادیاں خوبصورت مکانات، جھیلوں، جھرنوں اور آبشاروں کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر موسم بہار میں آپ کا گذر اس طرف ہو تو Blue Bell Flowers کا حسن آپ کا دل موہ لے گا۔ بعض لوگ بحری سفر کا مزہ لینے کے لیے

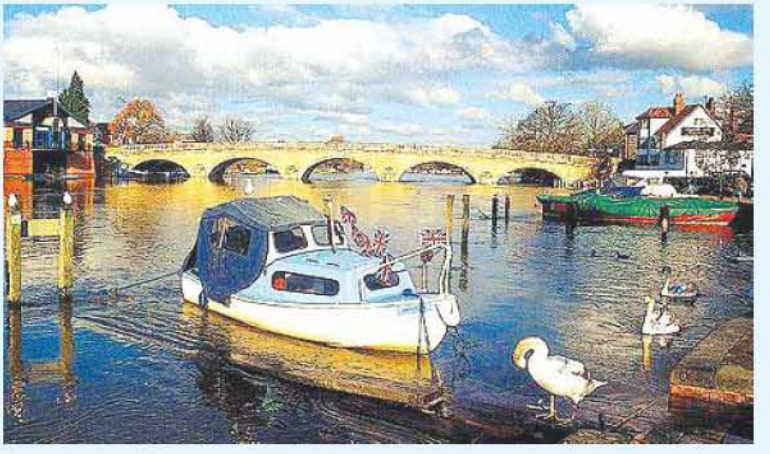

اس طرف Boats سے بھی آنکلتے ہیں۔

Runny Mede (رنی میڈ): دریائے ٹیمز کے پانی میں آئرن ایج، سیکسن Sexon عہد اور رومن ٹیوڈورس کی کہانیاں، وکٹورین صنعتی انقلاب، جنگ اور ایڈونچر کی بے شمار یادیں غوطہ زن ہیں۔ شاید اسی لیے بعض یوروپین مصنفین نے دریائے ٹیمز کو برطانیہ کا آبی انسائیکلوپیڈیا بھی کہا ہے۔

یہی وہ جگہ ہے جہاں کنگ جان نے مشہور عالم برطانوی دستاویز 'میگنا کارٹا' پر دستخط کیے اور اس پر شاہی مہر لگائی۔ ماڈرن رنی میڈ میں SPA اور Runny Mede Hotel سیاحوں کی اولین پسند ہے۔ یہ ہوٹل اب تک کئی قومی ایوارڈ جیت چکا ہے۔

Reading (ریڈنگ): یہ لاک، ریلوے اسٹیشن River Knnel کے نزدیک ہے۔ اس جگہ ریڈنگ کے علاوہ آپ Blake's Lock اور کاؤرس ہام لاک بھی دیکھ سکیں گے۔ اس کی خوشنما وادیاں باغات محلات شاپنگ مالز اور گفٹ شاپس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ صفائی وستھرائی کا وہ عالم کہ جیسے ملازمین روزانہ سڑکوں کو دھو جاتے ہوں۔ اپنی ان ہی خصوصیات کے سبب یہ علاقہ صدیوں سے سیاحوں کے لیے جنتِ نگاہ بنا ہوا ہے۔ رائل برک نامی شاہی منڈی کی زرین تاریخ اس علاقے سے وابستہ ہے۔ وکٹورین دور کی سرخ اینٹوں اور کوئلے سے بنی عمارتیں، چرچ، قلعوں کے باقیات، میوزیکل کنسرٹس، سالانہ میلہ اور سالانہ اسپورٹس کے مواقع پر یہاں عید اور دیوالی کا سا منظر ہوتا ہے۔ □

Hafizurraheman Ansari
H No. 55, Ansar Colony, Nayapura Ward
Malegaon Nasik- 423203 MS

ادارہ

یہ مزے مزے کی حکایتیں

♦ میں گھر لیٹ آیا تو پاپا نے پوچھا، ''کہاں تھے؟''

میں نے کہا دوست کے گھر پر تھا۔

پاپا نے میرے ہی سامنے میرے 10 دوستوں کو فون کیا۔

4 نے کہا، ''ہاں انکل، یہیں پر تھا۔''

2 نے کہا، ''ابھی ابھی نکلا ہے۔''

3 نے کہا، ''یہیں ہے انکل! پڑھ رہا ہے۔ فون دوں کیا؟''

1 نے حد کر دی اور کہا۔ ''ہاں پاپا۔ کہیے کیا ہوا؟''

پڑا دیا کم بختوں نے۔

نام نہیں لکھا

♦ ایک شخص نے اخبار میں اشتہار پڑھا۔

''ہم پانچ سو روپے میں ایک ایسی چیز دے رہے ہیں جسے پہن کر آپ تو لوگوں کو دیکھ سکیں گے مگر لوگ آپ کو نہیں دیکھ پائیں گے۔''

اس شخص نے پانچ سو روپے کا منی آرڈر بھیج دیا۔

چند روز بعد اسے کمپنی کی طرف سے ایک پارسل ملا۔

پارسل کھولا گیا تو اس میں ایک برقع رکھا ہوا تھا۔

♦ ماں (بیٹے سے): کیوں رو رہے ہو؟

بیٹا (سسکتے ہوئے): ماسٹر صاحب نے مارا ہے!

ماں: کیوں مارا؟

بیٹا: ماسٹر صاحب کی کرسی پر روشنائی گری ہوئی تھی۔ وہ بیٹھنے لگے تو مجھے لگا ان کے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔ بس میں نے ان کی کرسی کھینچ لی!

نام نہیں صرف شہر لکھا ہے۔ پر بھئی

♦ ڈاکٹر: آپ کا اور آپ کی بیوی کا بلڈ گروپ ایک ہے۔

مریض: ہوگا، ضرور ہوگا۔ 25 سال سے میرا خون جو پی رہی ہے!

شائلہ شیخ رفیق، شہادا، مہاراشٹر

♦ استاد: آدمی اور گدھے میں کیا فرق ہے؟

شاگرد: تھوڑا سا

استاد: وہ کیا؟

شاگرد: آپ آدمی کو گدھا کہہ سکتے ہیں لیکن گدھے کو آدمی نہیں کہا جا سکتا۔

رضیہ فیاض احمد

♦ ایک لڑکا کسی لڑکی کو دیکھ کر بولا، ''لفظ تیرے، آواز میری، غزل سناؤں کیا؟''

لڑکی بولی، ''ہاتھ میرے، گال تیرے، کان کے نیچے بجاؤں کیا؟''

محمد دانش شیخ، کونواری، اعظم گڈھ، یوپی

♦ ایک کوا مولوی صاحب کے ہاتھ سے گوشت جھپٹ کر لے گیا۔ مولوی صاحب نے چلا کر ایسی بات کہی کہ کوے نے گھبرا کر گوشت چھوڑ دیا۔ مولوی صاحب نے کہا تھا، ''مردود، گوشت چھوڑ ورنہ کل اعلان کرا دوں گا کہ کوا حرام نہیں ہے!''

ایمن افروز، سنجر پور، اعظم گڈھ

♦ بیٹے نے باپ سے کہا، ''رات میں نے ایک خواب دیکھا کہ میری

ایک ٹانگ زمین پر ہے اور دوسری آسمان پر۔"
باپ نے غصے سے کہا، "نالائق، ایسے خواب مت دیکھا کر۔"

نام نہیں لکھا

♦ سوال: قسمت پہلے ہی لکھی جا چکی ہے تو کوشش کرنے سے کیا ملے گا؟
بہترین جواب: کیا پتہ قسمت میں لکھا ہو کہ کوشش سے ہی سب ملے گا

♦ میں نے زندگی سے پوچھا، "تو سب کو غم کیوں دیتی ہے؟"
زندگی نے ہنستے ہوئے کہا، "میں تو سب کو خوشی دیتی ہوں۔ لیکن کیا کروں ایک کی خوشی دوسرے کا غم بن جاتی ہے!"

فرحین کشمیرن، بدایوں، یوپی

♦ سنتا: کل رات 3 گھنٹوں تک ایک انگریزی فلم دیکھتا رہا، مگر سسری میں نہ تصویر تھی نہ آواز؟

بنتا: فلم کا نام کیا تھا سنتا: نو ڈسک انسرٹیڈ No Disk Insereted

اے سعدی، بھیونڈی مہاراشٹر

♦ بیوی غصے میں بولی: تمھارے دماغ تو صرف گوبر بھرا ہے!
شوہر نے پیار سے کہا: تو پھر اتنی دیر سے کھا کیوں رہی ہو!

♦ بیوی: کل رات تم مجھے نیند میں برا بھلا کیوں کہہ رہے تھے۔
شوہر: تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔
بیوی: کیسی غلط فہمی؟
شوہر: یہی کہ میں نیند میں تھا!

ثنا لطیف قریشی، شہادا، نندر بار

♦ ایک آدمی چابی کی نوک سے اپنا کان کرید رہا تھا۔ سنتا پہلے تو اسے بڑے غور سے دیکھتا رہا تھوڑی دیر بعد اس کے پاس جا کر بولا، "بھائی صاحب اگر آپ اسٹارٹ نہیں ہو رہے ہو تو میں دھکا دوں؟"

طلیبہ نازرائے زادہ، دھولیا

♦ جب خدا سے بات کرنے کو جی چاہے تو کیا کریں؟
نماز پڑھو۔
اور جب جی چاہے کہ خدا مجھ سے بات کرے تو کیا پڑھوں؟
قرآن!

♦ دوستی نہ امتحان لیتی ہے نہ دیتی ہے۔
دوستی وہ ہوتی ہے جو بارش میں بھیگے چہرے پر آنسوؤں کو پہچان لیتی ہے!

ریشما فرحین مومن، مالیگاؤں

♦ باپ بیٹے سے: تم میرا نام ضرور چمکاؤ گے۔
بیٹا: جی ہاں ضرور۔
باپ: مگر کیسے؟
بیٹا: میں ٹیوب لائٹ پر آپ نام لکھ دوں گا!

عبدالمتین، مالیگاؤں

♦ دنیا کے زیادہ تر لوگ دن میں کم سے کم ایک بار ضرور ایک ٹانگ پر کھڑے ہوتے ہیں۔ بتاؤ کب؟
پتلون پہنتے وقت...

ہم نے کب مانگا ہے تم سے محبت کا صلہ؟
بس کبھی رستے میں ملو تو جوس پلا دیا کرو!

♦ طوفانی اندھیری رات میں قبرستان میں ایک بھوت دوسرے بھوت کو سمجھا رہا تھا:

گھبراؤ نہیں۔ کوئی رجنی کانت وانت نہیں ہوتا!

♦ سنتا: تم میتھ Maths میں کس وجہ سے فیل ہو گئے؟
بنتا: ٹیچر کی وجہ سے۔ ہماری ٹیچر کبھی کہتی تھی 5+3=8 کبھی 6+2=8 اور کبھی 8=4+4 اب بتاؤ وہ خود کنفیوزڈ تھی۔ مجھے کیا سکھاتی؟

♦ایک بہت ہی کلاسیکل انسلٹ (Insult توہین)

الڑکی: میں ابھی ابھی بیوٹی پارلر سے آرہی ہوں!

لڑکا: ارے؟ آج بھی بند تھا کیا؟

♦ آپ بہت اچھے،

ایمان دار،

مہذب،

خوب صورت،

خوش اخلاق،

سمجھ دار،

ذہین اور

ٹیلنٹڈ talented انسان ہیں

پتہ کیجیے، یہ افواہ کون اڑا رہا ہے؟

♦اگر کوئی آپ سے کہے کہ آپ

گڈ لکنگ Good Looking

اسمارٹ Smart

اور جینیئس Genius ہیں

تو بے وقوف کے کان کے نیچے ایک جھانپڑ دینا۔

نالائق نومبر کے مہینے میں اپریل فول بنا رہا ہے!

♦سچا دوست وہ ہے جو

آپ کی آنکھوں میں پہلا آنسو

دیکھ لے

دوسرا پونچھ لے

تیسرا روک لے

اور چوتھا آنسو دیکھ کر کہے

لاؤ یہ پیاز میں کاٹ دیتا ہوں!

♦خوش نصیب وہ نہیں جس کا نصیب اچھا ہے

خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہے!

ساحل ہمدم، مالیگاؤں

♦سر سے پاؤں تک کپڑے۔ ہاتھوں میں دستانے۔ ڈھکا ہوا سر!

کہنے کا مطلب یہ کہ سردی کا موسم لڑکے لڑکیوں کو کتنا مہذب باحیا بنا دیتا ہے!

♦سنتا ایک پبلک ٹائلٹ میں گیا تو دیکھا، وہاں کسی نے لکھ رکھا تھا

دنیا چاند پر پہنچ گئی اور تو یہاں بیٹھا ہے!

سنتا نے اس کے نیچے لکھ دیا:

بس یار، ایک منٹ میں چلتا ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہاں پانی نہیں ہے!

♦امتحان میں،

لڑکیوں کا ٹینشن: سوال سلیبس Syllabus سے باہر نہ آجائے

لڑکوں کا ٹینشن: سیٹ نمبر سب سے اگلی بنچ کا نہ نکل آئے

♦سنتا نے کیفے میں ایک لڑکی سے کہا: آئی لو یو I love you

اس پر لڑکی نے اسے ایک چانٹا مارا اور بولی: کیا کہا تو نے؟

سنتا بولا: جب سنا ہی نہیں تو چانٹا کیوں مارا

♦سنتا: بتاؤ ہوائی جہاز پر کیسے رنگ کرتے ہیں؟

بنتا: پہلے اسے آسمان میں لے جاتے ہیں۔ پھر جب وہ دیکھنے میں بہت چھوٹا پڑ جاتا ہے تو اسے رنگ دیتے ہیں۔

♦ استاد: بچو بتاؤ چائے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ۔
شاگرد: سر، جب کوئی ہمیں اپنے پیسے سے پلائے تو فائدہ مند ہے اور اگر ہمیں اپنے پیسے سے پلانی پڑے تو نقصان دہ!

♦ میری گزارش ہے کہ صبح کو گڈ مارننگ کا میسج بھیجنے کی بجائے آلو کا پراٹھا بھیج دیا کرو۔ مارننگ اپنے آپ گڈ ہو جائے گی!

♦ حامد، دکان دار سے: تمھارے پاس سوجی ہے؟

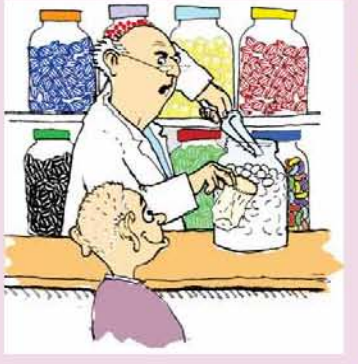

دکان دار: ہاں ہے
حامد: چینی ہے؟
دکان دار: وہ بھی ہے؟
حامد: اور گھی؟
دکان دار ہاں بھئی وہ بھی ہے...
حامد: تو پھر حلوا کیوں نہیں بنا لیتے!

♦ ٹیچر: بتاؤ بچو اگر دنیا میں پانی نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟
حامد: سر، اگر زمین پر پانی نہیں ہوگا تو ہم تیر نہیں پائیں گے اور ڈوب کر مر جائیں گے!

♦ سنتا: تمھاری بیوی کا نام کیا ہے؟
بنتا: گوگل
سنتا: یہ کیسا نام ہے؟
بنتا: یار میں جہاں بھی جاتا ہوں وہ مجھے ڈھونڈ لیتی ہے!

♦ ہم کو یوں پاگل بنانا چھوڑ دو
بے وجہ ہر بات پر ستانا چھوڑ دو
تمھاری خوش بو الگ ہی ہوتی ہے یار
برتن دھونے کے صابن سے نہانا چھوڑ دو

♦ کیا آپ انگریزی کے ان لفظوں کو تیزی سے زور زور دوہرا سکتے ہیں؟

My
A My
They My
They They My
A My They Na My

ہاہاہا!
کھلے پیسے نہیں، معاف کرو بابا!

♦ سنتا کی شادی میں سب کو بار بار پانی پلایا جا رہا تھا۔ بنتا بھوک سے بے حال ہو کر چلایا: ''بھائی بریانی ملے گی؟ گلے میں پانی اٹک گیا ہے!''

♦ میرا تعلق 'دبستان مالیگاؤں' سے ہے اور یہاں 'بچوں کی دنیا' بہت ہی مقبول ہے۔ یہ رسالہ واقعی خوب صورت ہے اور اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی طباعت اور رنگینی سے اس کی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ میں آپ کو مزاحیہ چیزیں بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

عطاالرحمٰن، مالیگاؤں

اتنے سارے چھاپ تو دیے یہ سب آپ ہی کے تو بھیجے ہوئے میسج ہیں۔ اب اور کتنی کوشش کریں گے۔ ویسے میسج آپ کے اچھے ہیں۔ یوں ہی بھیجتے رہیے!

♦ ایک گنجا لیڈر تقریر کر رہا تھا اور بتا رہا تھا کہ میں نے عوام کے لیے یہ کیا ہے وہ کیا ہے۔ آخر میں اس نے کہا: ''میں نے آپ کے لیے بہت کچھ کیا ہے اور بہت کچھ اب بھی کروں گا۔ ایسا کوئی کام نہیں جو میں آپ کے لیے نہ کر سکوں۔ بتائیے میں کیا نہیں کر سکتا؟''
ایک لڑکے نے کہا: ''آپ کنگھا نہیں کر سکتے!''

محمد رضاالحق محمد زبیرالحق ناندیڑ، مہاراشٹر

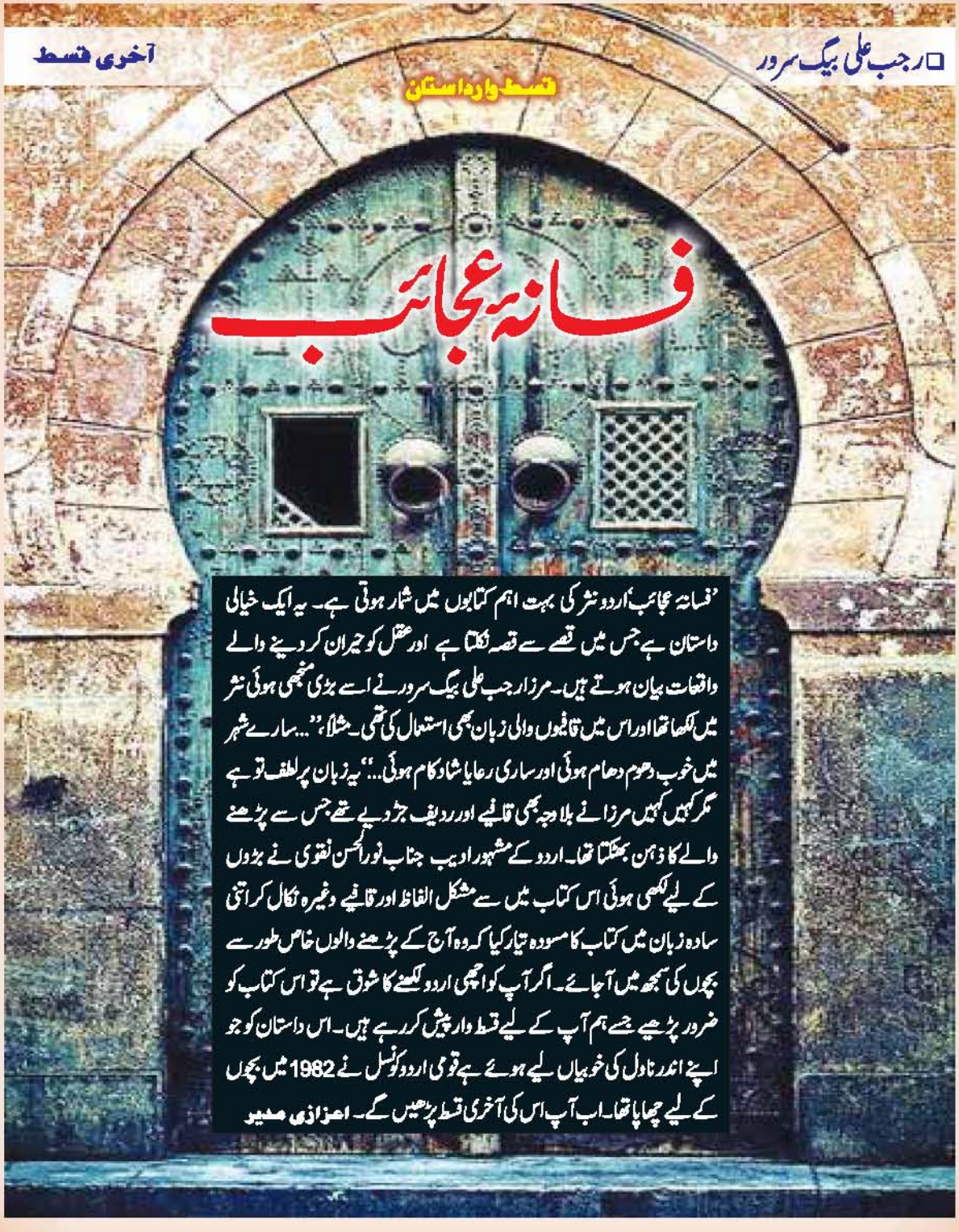

□ رجب علی بیگ سرور

قسط وار داستان

آخری قسط

فسانۂ عجائب

'فسانۂ عجائب' اردو نثر کی بہت اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ ایک خیالی داستان ہے جس میں قصے سے قصہ نکلتا ہے اور عقل کو حیران کر دینے والے واقعات بیان ہوتے ہیں۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے اسے بڑی منجھی ہوئی نثر میں لکھا تھا اور اس میں قافیوں والی زبان بھی استعمال کی تھی۔ مثلاً ''...سارے شہر میں خوب دھوم دھام ہوئی اور ساری رعایا شاد کام ہوئی...'' یہ زبان پر لطف تو ہے مگر کہیں کہیں مرزا نے بلاوجہ بھی قافیے اور ردیف جڑ دیے تھے جس سے پڑھنے والے کا ذہن بھٹکتا تھا۔ اردو کے مشہور ادیب جناب نورالحسن نقوی نے بڑوں کے لیے لکھی ہوئی اس کتاب میں سے مشکل الفاظ اور قافیے وغیرہ نکال کر اتنی سادہ زبان میں کتاب کا مسودہ تیار کیا کہ وہ آج کے پڑھنے والوں خاص طور سے بچوں کی سمجھ میں آجائے۔ اگر آپ کو اچھی اردو لکھنے کا شوق ہے تو اس کتاب کو ضرور پڑھیے جسے ہم آپ کے لیے قسط وار پیش کر رہے ہیں۔ اس داستان کو جو اپنے اندر ناول کی خوبیاں لیے ہوئے ہے قومی اردو کونسل نے 1982 میں بچوں کے لیے چھاپا تھا۔ اب آپ اس کی آخری قسط پڑھیں گے۔ **اعزازی مدیر**

اب تک آپ نے پڑھا: ملک ختن کے شہر فصحت آباد میں ایک بادشاہ تھا فیروز بخت۔اس کے اکلوتے بیٹے شہزادہ جان عالم نے ایک شہزادی ماہ طلعت سے شادی کے بعد ایک بولنے والا طوطا بازار سے خریدا جو دنیا بھر کی باتیں جانتا تھا۔ ایک دن اس نے بتایا کہ ایک ملک ہے زر نگار جس کی ملکہ انجمن آرا دنیا میں سب سے حسین ہے۔ شہزادہ انجمن آرا کی تلاش میں نکل پڑا۔ راستے میں کئی مشکلیں آئیں۔ ایک جگہ ایک جادوگرنی کے جال میں پھنس گیا جو اسے اپنے محل لے گئی اور اس سے زبردستی شادی رچانے لگی۔ جان عالم اس کی قید سے نکل آیا۔ راستے میں اسے ملکہ مہر نگار ملی۔ اس نے اپنے والد سے ملایا جو حکومت چھوڑ کر عبادت گزار بن چکے تھے۔ انھوں نے جان عالم کو خدا کے ناموں کا ایک تعویذ دیا جو ہر جادو کو توڑ دیتا تھا۔ ان سے رخصت ہو کر جان عالم زرنگار پہنچا جہاں پتہ چلا کہ انجمن آرا ایک جادوگر کی قید میں ہے۔ وہ جادوگر سے لڑنے چل دیا اور تعویذ کی مدد سے کامیاب رہا۔ انجمن آرا کی واپسی پر اس کے باپ نے خوش ہو کر جان عالم سے انجمن آرا کی شادی کر دی۔ کچھ دن گزار کر جان عالم گھر واپس چل دیا۔ راستے میں دونوں کی ملاقات ملکہ مہر نگار اور اس کے بزرگ والد سے ہوئی۔ دونوں کچھ روز اُن کے ساتھ رہے۔ مہر نگار اب بھی جان عالم کو چاہتی تھی۔ دونوں کی شادی ہو گئی۔ دونوں بیویوں کو لے کر جان عالم وطن واپس چلا تو بزرگ نے کسی بھی جاندار کے مردہ جسم میں اپنی روح داخل کرنے کی ترکیب اسے بتائی اور کہا کہ کسی کو یہ راز نہ بتانا ورنہ دکھ اٹھاؤ گے۔ مگر اس نے اپنے دوست وزیرزادے کو یہ بھید بتا دیا۔ لالچی دوست نے دھوکے سے جان عالم کو بندر کے جسم میں داخل کرایا اور خود جان عالم بن گیا۔ مگر دونوں بیویوں کو اس پر شک ہوا اور وہ اس سے دور رہنے لگیں۔ وزیر زادہ اصلی جان عالم کو مارنے کے لیے بندروں کی جان لینے لگا وہ دس روپے میں ایک بندر خریدتا اور مار ڈالتا۔ ادھر جان عالم بندر کی صورت میں ایک غریب چڑی مار کے ہاتھ آ گیا۔ وہ اسے انعام کے لالچ میں وزیر زادے کے پاس لے چلا۔ جان عالم نے اس کی بیوی کو ایک بادشاہ کی کہانی سنائی جس نے ایک سلطنت دے کر دو سلطنتیں پائیں اور لالچی آدمی کا برا انجام ہوا۔ بیوی کو اس پر ترس آگیا اور اس نے چڑی مار کو بندر کی جان بچانے کے لیے منا لیا۔ انسان کی طرح بولتے بندر کی خبر ایک رحم دل سوداگر کو ملی تو اس نے بھاری رقم دے کر بندر خرید لیا۔ خبر وزیر زادے کو ملی تو اس کے ساتھ ملکہ کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ بندر ہی دراصل جان عالم ہے۔ وزیر زادے نے سوداگر کو حکم دیا کہ بندر اس کے حوالے کر دے۔ سوداگر نے ٹھان لی کہ جان پر کھیل کر بھی اسے بچائے گا۔ وہ اسے ایک جلوس کی شکل میں محل کی طرف لے چلا۔ جلوس ملکہ کے جھروکے کے نیچے آیا تو ملکہ نے اسے روک لیا۔ بندر جو کہ جان عالم تھا اسے دیکھ کر رو پڑا اور بتایا کہ وزیر زادے نے کیسے اسے بندر کے جسم میں قید کر دیا تھا۔ یہ سنتے ہی ملکہ نے اپنے طوطے کو مار دیا۔ جان عالم مردہ طوطے کے جسم میں داخل ہو گیا اور بندر مردہ ہو گیا۔ ملکہ نے نقلی جان عالم کو رجھا کر ایک بکری کا بچہ منگایا اور پالنے لگی۔ ایک دن بچے کو مار کر ضد کی کہ کسی طرح اسے زندہ کر۔ ملکہ کی خوشی کے لیے نقلی جان عالم نے اپنی روح مردہ بچے میں ڈال دی۔ بکری کا بچہ زندہ ہوا تو اصلی جان عالم طوطے سے اپنی روح کو اصلی جسم میں لے آیا اور وزیر زادہ بچے کے جسم میں قید ہو گیا۔ اب یہ لوگ واپس چلے مگر راہ میں شہپال جادوگر سے مڈبھیڑ ہو گئی جو اسی جادوگرنی کا باپ تھا جس نے شادی کے لیے جان عالم کو قید کیا تھا۔ مہر نگار کے عبادت گزار والد کی مدد سے انھوں نے جادوگرنی اور اس کے باپ کی جادو نگری تباہ کی اور واپسی چل دیے۔ اس بار ایک جہاز پر سوار ہوئے جو طوفان میں پھنس کر تباہ ہو گیا۔ جان عالم کسی طرح بچ گیا مگر انجمن آرا اور مہر نگار بچھڑ گئیں۔ لوگوں نے اسے ایک کرامتی جوگی کے بارے میں بتایا جس نے جان عالم سے کہا کہ جیسے بھگوان نے جڑواں بھائیوں کا کام بنایا ایسے ہی تیرا بھی بنائے گا۔ اب آگے اس لمبی داستان کا آخری حصہ پڑھیے:

جان عالم کے دل میں جڑواں بھائیوں کا حال جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے جوگی سے پوچھا کہ ان کا کیا قصہ ہے۔ اس پر جوگی نے یہ کتھا سنائی۔

جڑواں بھائیوں کی کہانی

ایک شہر میں دو جڑواں بھائی رہتے تھے۔ دونوں کو سیر اور شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک دن دونوں شکار کو نکلے۔ ایک ہرن دکھائی دیا۔ چھوٹے بھائی نے تیر مارا مگر وہ نہ لگا اور ہرن چوکڑیاں بھرنے لگا۔ انھوں نے بھی گھوڑے ان کے پیچھے ڈال دیے اور بہت دور نکل آئے۔ آخر بڑے بھائی کے تیر سے وہ ڈگمگا کر گرا۔ ان دونوں نے اسے ذبح کیا اور وہیں آگ پر بھون کے کھایا۔ تھکے ہوئے تھے۔ پیٹ بھرا تو نیند آنے لگی۔ چاروں طرف جنگل بیابان تھا۔ جنگلی جانور اور سانپ بچھو کا ڈر تھا۔ اس لیے یہ مشورہ ہوا کہ پہلے بڑا بھائی سوئے اور چھوٹا جاگ کے پہرہ دے۔ پھر آدھی رات چھوٹا سوئے اور بڑا پہرا دے۔

غرض یہ کہ بڑا بھائی سو گیا۔ چھوٹا تیر کمان لیے پہرہ دینے لگا۔ جب آدھی رات گزری تو ایک درخت پر دو پرندے اپنی اپنی تعریف کرنے لگے۔ ایک بولا "میرے گوشت میں یہ تاثیر ہے کہ جو کھائے ایک لعل تو پہلے ہی دن ذرا سی دیر میں اُگلے، پھر ہر مہینے اس کے منہ سے ایک لعل نکلے۔" دوسرے نے کہا "جو شخص میرا گوشت کھائے وہ اسی دن بادشاہ ہو جائے۔" یہ جانوروں کی بولی سمجھتا تھا۔ ساری بات سمجھ گیا، تاک کے تیر مارا تو دونوں اس میں چھد کے زمین پر آ گرے۔ اس نے دونوں کے کباب بنائے۔ جس پرندے کے گوشت میں

بادشاہ بنانے کی تاثیر تھی اس کے کباب خود کھائے، دوسرے پرندے کے کباب بھائی کے لیے اٹھا رکھے۔ خوشی اتنی تھی کہ بڑے بھائی کو پہرہ دینے کے لیے نہ جگایا خود ہی تیر کمان لیے ٹہلتا رہا۔ دو گھڑی کے بعد اس نے لعل اگلا تو سمجھ گیا کہ دھوکا ہو گیا۔ جس کا گوشت کھانا چاہتا تھا وہ تو چوک سے بھائی کے لیے رکھ دیا اور دوسرے کا خود کھا لیا۔ دل میں سوچا یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔

دن نکلا تو اس نے بڑے بھائی کو جگایا، دوسرے پرندے کے کباب اسے کھلائے۔ پھر سارا قصہ سنایا اور کہا "بھائی سلطنت مبارک ہو۔" یہ کہہ کے وہ لعل اسے نذر کیا۔ وہ بہت خوش ہوا، بولا یہ قیمتی لعل لے کر ہم گھر جائیں گے تو ہم سے کوئی نہ خریدے گا۔ سب شک کریں گے کہ اس کے پاس کہاں سے آیا۔ سامنے آبادی نظر آتی ہے، تم یہاں ٹھہرو۔ میں وہاں جا کر لعل بیچ آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر ادھر چلا۔ شہر کے دروازے پر پہنچا۔ بڑی بھیڑ نظر آئی۔ اس شہر کا یہ دستور تھا کہ بادشاہ مر جاتا تو اسے دفنانے کے بعد امیر وزیر تخت لے کر شہر پناہ کے دروازے پر آ جاتے۔ جو آدمی پہلے داخل ہوتا اسی کو بادشاہ بنا دیتے۔ یہ جیسے ہی داخل ہوا، لوگوں نے سے تخت پر بٹھا لیا، سلامی دی، نذریں پیش کیں۔

اس دن تو خوشی میں اسے بھائی کا خیال ہی نہیں رہا اگلے دن بہت ڈھونڈوایا مگر پتہ نہ چلا۔ لعل کو اس کی نشانی سمجھ کے وہ روز دیکھتا

اور اسے یاد کرتا تھا۔

چھوٹے بھائی پہ یہ گزری کہ ایک ڈراؤنی شکل کا پرندہ آیا اور اسے پنجے میں دبا کے لے اڑا۔ بہت دور جا کر وہ پرندہ ایک کنویں کی جگت پر بیٹھا تو یہ چھوٹ کے اندر جا گرا۔ اتفاق دیکھو کہ اسی وقت ادھر سے ایک قافلہ گزرا۔ کسی نے پانی بھرنے کو ڈول کنویں میں ڈالا تو یہ رسی کے سہارے باہر نکلا۔ لڑکا اچھی شکل کا تھا، قافلے کے سردار نے اسے غلام بنا کے اپنے پاس رکھ لیا۔

ادھر یہ قافلہ منزل پر پہنچا اور ادھر مہینہ پورا ہوا۔ اس نے دوسرا لعل اگلا، سوداگر نے سوچا ایسی قیمتی چیز چپ چاپ نہ رکھو۔ پتہ نہیں کل کیا ہو۔ اس کی شہرت ہو جائے۔ سوداگر لڑکے کو کوتوال کے پاس لے گیا کہ اس نے میرا لعل چرایا ہے اسے بند کر دو۔ کوتوال نے اسے رات بھر حوالات میں رکھا۔ صبح بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کی اکلوتی بیٹی تھی جس کی ہوشیاری اور لیاقت کا دور دور چرچا تھا۔ سارے مقدموں کے فیصلے وہی کرتی تھی۔ شہزادی نے لڑکے سے پوچھا "تو نے لعل چرایا ہے۔" یہ جان سے عاجز تھا بولا "ہاں چرایا ہے۔" شہزادی نے اس وقت کچھ نہیں کہا۔ اپنی ڈیوڑھی میں قید کر دیا۔ پھر اکیلے میں بلا کے پوچھا۔ لڑکے نے سارا قصہ سنایا۔ شہزادی سن کے خوش ہوئی کہ اس کا خیال ٹھیک تھا۔ یہ لڑکا چور نہیں ہو سکتا۔ اگلے دن دربار میں بادشاہ کو شہزادی نے سارا ماجرا سنایا۔ اسے یقین نہ آیا۔ شہزادی نے کہا "آزمانا کیا مشکل ہے، کچھ دن اسے اپنے پاس رکھو، اگلے تو سچا، ورنہ جھوٹا۔" یہ بات سب کے دل کو لگی۔ ایک مہینے کا انتظار کیا گیا تو لڑکے نے پھر ایک لعل اگلا اور سب کو یقین آ گیا کہ وہ چور نہیں ہے۔ لڑکا سچا تو نکلا ہی خوب صورت بھی تھا سو بادشاہ کو خیال آیا کہ کیوں نہ اسے داماد بنا لے۔ آخر شہزادی کے ساتھ اس کی شادی ہو گئی۔

کوئی سال بھر گزرا ہو گا کہ بڑے بھائی کا ایلچی بادشاہ کے دربار میں آیا۔ لعل و جواہرات کی بات نکلی تو اس نے کہا "ہمارے بادشاہ کے پاس ایسا لعل ہے کہ کہیں دیکھا نہ سنا۔ بادشاہ روز اسے دیکھتا ہے۔" اس بادشاہ نے یہ سنا تو دس بارہ لعل جو اس عرصہ میں داماد نے اگلے تھے سامنے رکھ وا دیے۔ وہ دیکھ کے حیران ہوا۔ بادشاہ نے اپنے داماد کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "ہر مہینہ ایک لعل اگلتا ہے۔" یہ بات سن کے ایلچی اور بھی حیران ہوا۔ لڑکے کو دیکھا تو اپنے بادشاہ کا ہم شکل پایا۔

ایلچی نے واپس آ کر یہ سارا قصہ اپنے بادشاہ سنایا کہ حضور کی شکل کا ایک لڑکا ہے جو ہر مہینے ایسا لعل اگلتا ہے جیسا آپ کے پاس ہے۔ وہ سن کے سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ میرا بھائی ہے۔ اسے محبت سے بھرا خط لکھا کہ جلد مجھ سے آ ملو۔

اس نے خط پایا تو بھائی کی محبت نے جوش مارا۔ شہزادی کو ساتھ جہاز میں بیٹھایا اور چل نکلا۔ قسمت دیکھو راستے میں یہ جہاز تباہ ہو گیا۔ شہزادی کسی طرح بڑے بھائی تک پہنچی اور جہاز ڈوبنے کا قصہ سنایا۔ اسے بڑا ملال ہوا۔ چھوٹے بھائی پہ یہ گزری کہ ڈوبتا اچھلتا ایک تخت کے سہارے کنارے پہنچا۔ پھر پتہ پوچھتے پوچھتے بڑے بھائی کے دربار میں پہنچا۔ اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ کوئی پہچان نہ سکا۔ اس نے کہا "ذرا دیر بعد میں لعل اگلوں گا تب تم سب کو یقین ہو گا۔"

شہزادی نے کہا "میرا شوہر بڑا ذہین، بڑا عقل مند تھا۔ ایک معمہ پوچھتی ہوں، صحیح جواب دیا تو تو وہی ہے۔ بتاؤ کیا چیز ہے جسے ہندو، مسلمان، یہودی، عیسائی سب کھلے بندوں کھاتے ہیں مگر اس کا سر کاٹ لو تو زہر ہو جائے، جو کھائے مر جائے۔

جوان نے ہنس کر کہا "شہزادی وہ چیز قسم ہے۔" یہ سنتے ہی شہزادی چلمن اٹھا کے دوڑی اور اس کے قدموں پر گر پڑی کہا "بے

شک تو وہی ہے، میں نے تجھے پہچانا۔ قسم ہی ہے جو سب کھاتے ہیں مگر اس کا سر کاٹ لو تو صرف 'سم' رہ جاتا ہے۔ سم زہر کو کہتے ہیں اور اسے کھانے والا مر جاتا ہے۔"

بادشاہ نے بھی اٹھ کے اسے گلے سے لگالیا۔ ذرا دیر میں اس نے لعل اگلا۔ ہر طرف خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔

یہ قصہ سنانے کے بعد جوگی نے کہا "دیکھا تو نے، خدا چاہے تو بچھڑے اس طرح ملتے ہیں۔"

انجمن آرا سے ملاقات

جوگی نے کہا "میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ مرجاؤں تو میری آخری رسمیں پوری کر دینا اور دائیں طرف کو چلے جانا۔ اللہ چاہے تو منزل ملے گی۔" پھر اسے کوئی منتر سکھایا کہ اسے پڑھو پھر جس جانور کو دھیان کرو خود وہی بن جاؤ۔ اتنا کہہ کے جوگی لیٹ گیا اور پرلوک کو سدھارا۔ جان عالم کو بڑا غم ہوا۔ اس نے دفن کرنا چاہا تو دیکھا کہ چادر میں پھولوں کے سوا کچھ نہیں۔ آدھی چادر اس کے مریدوں نے آپس میں بانٹ لی اور آدھی اس کے چیلوں نے۔

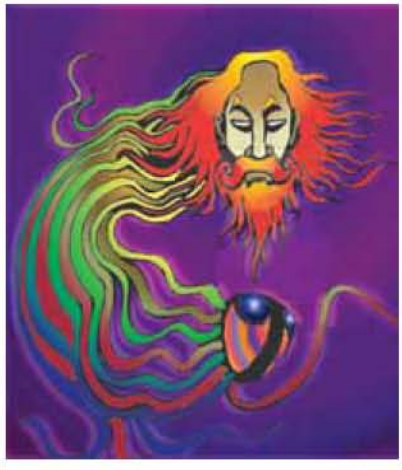

اب جان عالم جوگی کے بتائے ہوئے راستے پر چلا۔ ذرا دور چل کے دیکھا کہ دریا میں ایک قیمتی لعل تیر رہا ہے۔ ذرا آگے چلا تو ایسا ہی لعل اور دیکھا۔ پھر پتہ چلا کہ یہ سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ کنارے کنارے چلتے ہوئے ایک عالی شان عمارت تک پہنچا۔ یہ چشمہ یہیں سے نکلا تھا مگر اندر جانے کا کوئی راستہ نہ پایا۔ اس نے جوگی کے بتائے ہوئے منتر کو آزمایا اور بلبل بن کے دیوار پر جا بیٹھا۔ اندر باغ تھا، بنگلہ تھا مگر آدمی کا نام و نشان نہ تھا۔ یہ دیوار سے اڑ کے زمین پر آیا اور پھر اپنی اصلی شکل اختیار کر لی۔

اپنی اصلی شکل میں آنے کے بعد شہزادہ آگے بڑھا اور بنگلے میں داخل ہوا۔ یہاں عجب ماجرا دیکھا کہ زمرد کے پایوں کا ایک پلنگ بچھا ہے۔ اس پر کوئی دوشالہ تانے سوتا ہے۔ اس کے پاس ہی یاقوت کی تپائی پر گل دان میں سرخ اور سفید پھول سجے ہیں۔ جان عالم نے قدم بڑھا کے دوشالہ سرکایا۔ دیکھا خالی بدن ہے، سر غائب ہے، ادھر ادھر دیکھا، اچانک چھت پر نظر پڑی تو دیکھا کہ چھینکے میں سر دھرا ہے۔ اس کے نیچے نہر بہتی ہے۔ اس میں سر سے قطرہ قطرہ خون ٹپکتا ہے اور لعل بن جاتا ہے۔ سمجھ گیا کہ یہ سب جادو کا کارخانہ ہے۔

قریب جا کے غور سے دیکھا تو پہچانا کہ سر انجمن آرا کا ہے۔ سر اور تن کا ہوش نہ رہا۔ چاہا کہ سر ٹکرا کے جان دے دے۔ پھر سوچا کہ مرجانا کیا مشکل ہے مگر پہلے یہ جان لوں کہ اس طلسم کا کیا بھید ہے۔

اتنے میں شام ہوگئی۔ زور کی آندھی آنے لگی۔ جان عالم کو اب اچھا خاصا تجربہ ہو چکا تھا، سمجھ گیا کہ کسی دیو یا جن کی آمد ہے۔ اب چھپ جانا چاہیے۔ ذرا دیر میں ایک قوی ہیکل ہیبت ناک دیو آپہنچا۔ اس نے گلدستے سے ایک سفید پھول لے کے سر کو سنگھایا۔ وہ فوراً اچھل کے بدن سے آ جڑا۔ انجمن آرا اٹھ بیٹھی۔

دیو نے انجمن آرا سے کہا کہ "آج انسان کی بو آتی ہے۔" شہزادی نے جواب دیا "تو دیوانہ ہوا ہے۔ یہاں دور تک نہ آدم ہے نہ آدم زاد۔" صبح تک وہ دیو ملکہ کو ادھر ادھر کی باتیں سناتا رہا۔ وہ بے دلی سے ہاں ہوں کرتی رہی۔ دن نکلنے لگا تو اس نے گلدان سے سرخ پھول لے کے اسے سنگھایا سر پھر اسی طرح دھڑ سے الگ ہو کے چھینکے میں لٹک گیا۔ دیو نے دھڑ کو دوشالے سے ڈھکا اور وہاں سے چلا گیا۔

دیو کے چلے جانے کے بعد شہزادہ پھر اپنی شکل میں آیا اور سفید پھول توڑ کے انجمن آرا کو سنگھایا۔ پہلے کی طرح سر بدن سے جڑ گیا اور وہ اٹھ بیٹھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا۔ دونوں اس زور شور سے روئے کہ سارا باغ دہل گیا۔ ادھر سے اتفاقاً اسی وقت ایک سفید

دیو کا گزر ہوا۔ وہ بہت نیک اور رحم دل تھا۔ اس نے رونے کی آواز سنی تو سمجھ گیا کہ کوئی انسان مصیبت میں پھنسا ہے۔ باغ میں پہنچا۔ حال پوچھا، شہزادے نے ساری کہانی سنائی۔ اسے ترس آیا۔ بولا ''فکر نہ کر اب وہ موذی آئے گا تو اپنے انجام کو پہنچے گا۔''

اتنے میں وہ ظالم بھی آپہنچا۔ تینوں کو باغ میں ٹہلتے دیکھا تو بہت غضب ناک ہو کر حملہ آور ہوا۔ سفید دیو نے دیکھتے دیکھتے اسے گرالیا۔ شہزادے نے آگے بڑھ کے اس کی گردن سر سے جدا کردی۔

اس ظالم سے چھٹکارا پاکے اور سفید دیو کا شکریہ ادا کر کے دونوں مہرنگار کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ گئے تو شہزادے نے جوگی کا بتایا ہوا عمل انجمن آرا کو بتایا اور دونوں طوطے بن کے اڑ چلے۔

مہرنگار کا احوال

اب مہرنگار کا حال سنو۔ جہاز تباہ ہوا تو یہ بھی ایک تختے کے سہارے ڈوبتی تیرتی چلی جاتی تھی۔ سامنے سے کسی بادشاہ کا جہاز آتا تھا۔ اس نے ترس کھا کے پن سوئی (چھوٹی کشتی) دوڑائی، اور اس کی جان بچائی۔ قریب سے دیکھا تو چہرہ ماہتاب بلکہ آفتاب۔ بادشاہ جی جان سے اس پر فدا ہوگیا۔ ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں۔ شہزادی بڑی مشکل سے ہوش میں آئی۔ سامنے ایک اجنبی کو دیکھ کے شرمائی، سر جھکالیا اور مارے شرم کے پسینہ پسینہ ہوگئی۔ اس نے بہت پوچھا کون ہو مگر اس نے صرف یہی بتایا کہ ہم تو آفت کے مارے ہیں۔ اس نے دنیا دیکھی تھی سمجھ گیا کوئی شہزادی ہے مگر مصیبت کی ماری ہے۔

ایک دن بادشاہ نے مہرنگار سے کہا ''اب تم تنہائی میں گھبراتی ہو، تمہارا ڈوبنا اور تیرنا تو محض بہانہ تھا خدا کو اسی طرح ملانا تھا، امیدوار ہوں کہ مجھ سے شادی کرلو۔'' ملکہ نے سوچا اب ہر طرح اس کے اختیار میں ہوں۔ یہ زبردستی کرلے تو میں کیا کرلوں گی مگر ٹالنے کو کہا ''مجھے ایک سال کی مہلت دو۔ اس عرصے میں میرا کوئی وارث ادھر آنکلا تو اچھا ہے ورنہ تیرے اختیار میں ہوں۔'' اس نے بھی سوچا ڈوب کے کون ابھرا ہے۔ ایک سال کی مدت کیا ہے پلک جھپکتے گزر جائے گی۔

بادشاہ نے ملکہ کے رہنے کو ایک خوبصورت محل دے دیا۔ اس میں ایک خوب صورت باغ تھا اور باغ بھی ایسا کہ جو جنت کے باغ کو شرماتا تھا۔ ملکہ اکثر شام کو باغ میں ٹہلتی اور اپنا غم غلط کرتی۔ ایک شام کو دل کچھ زیادہ ہی بھر آیا۔ بے اختیار ہو کے رونے لگی۔ درختوں پر پرندے بسیرہ لیتے تھے۔ جس درخت کے نیچے ملکہ کھڑی تھی اس کی ایک ٹہنی پر ایک طوطا آبیٹھا۔ اس نے ملکہ کو ایسے بلک بلک کر روتے

دیکھا تو اس کا حال پوچھا۔ ملکہ کو ایسا کون نصیب تھا جو اس کی حالت پوچھے۔ طوطے نے پوچھا تو ساری کہانی اسے کہہ سنائی۔

طوطے نے ساری داستان سنی تو زمین پر گر کے پر نوچنے لگا۔ ملکہ حیران ہوئی کہ اسے کیا ہوگیا۔ گھڑی بھر میں طوطا سنبھلا تو اس نے کہا ''اے ملکہ مہرنگار! میں وہی کم بخت طوطا ہوں جس نے جان عالم کو انجمن آرا کے حسن کی خبر سنائی تھی۔ میں ہی اس کی بربادی کا سبب ہوں۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ جان عالم اور انجمن آرا دونوں سلامت ہیں۔ مجھے نجومیوں نے بتایا ہے کہ سب کے مقدر میں مصیبتیں ضرور ہیں مگر سب خیریت سے ہیں۔ ایک دن سب مل جائیں گے۔''

طوطا رات کی رات تو ملکہ کے پاس رہا، صبح کو کھوئے ہوؤں کی تلاش میں اڑ چلا۔ اڑنے سے پہلے شہزادی نے جان عالم کے نام ایک خط لکھ کے اس کے بازو سے باندھ دیا۔ دن بھر ان دونوں کی تلاش میں اڑتا، رات کو تھک ہار کے کسی ٹہنی پر بیٹھ جاتا۔ ایک شام کو اتفاق سے یہ طوطا اسی درخت پر آبیٹھا جس پر جان عالم اور انجمن آرا طوطے کی شکل بنائے بیٹھے تھے۔ طوطے کو اپنے مالک کا خیال آیا تو رونے لگا۔

انجمن آرا نے کہا ”دیکھنا یہ طوطا روتا ہے شاید اس نے بھی ہماری طرح رنج اٹھائے ہوں۔“ طوطا تو انسان کی بولی سمجھتا تھا، کہنے لگا ”خدا تمہیں وہ غم نہ دکھائے جو میں نے سہے ہیں۔ میں ایسا بدنصیب ہوں کہ میرے سبب میرے مالک کا گھر بار چھٹا اور اسے دردر ٹھوکریں کھانی پڑیں۔“

جان عالم نے تفصیل پوچھی تو اس نے شروع سے آخر تک ساری داستان سنادی۔ مہرنگار کی خیریت سن کے دونوں باغ باغ ہوگئے اور فوراً اپنی اصلی شکلوں میں طوطے کے سامنے ظاہر ہوئے۔ طوطے نے مہرنگار کا خط دیا۔ جان عالم نے اسے آنکھوں سے لگایا۔

تینوں نے رات وہیں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی جان عالم اور انجمن آرا نے پھر طوطے کی شکل بنائی اور منزل کی طرف اڑ گئے۔ آگے آگے طوطا راستہ بتاتا تھا، یہ دونوں پیچھے اڑے چلے آتے تھے۔

مہرنگار سے ملاقات

جان عالم شہزادی اور طوطے کے ساتھ آٹھویں دن ملکہ کے پاس پہنچا۔ جس دن سے طوطا روانہ ہوا تھا، مہرنگار روز بلاناغہ اس پیڑ کے نیچے آکے اس کا انتظار کرتی تھی۔ اس دن بھی وہ روز کی طرح درخت کے نیچے کھڑی تھی، آنکھوں میں آنسو جاری تھے۔ اچانک طوطے نے سلام کیا۔ ملکہ نے بے چین ہوکے پوچھا ”جلدی بتا، جن کے لیے دل بے تاب ہے ان کا کہیں پتہ پایا؟“ وہ بولا ”جب پیاروں کی خبر پوچھتے ہیں تو پہلے انعام دیتے ہیں، میں کوئی اچھی خبر سناؤں گا تو کیا انعام پاؤں گا؟“

شہزادی سمجھ گئی کہ کوئی اچھی خبر لایا ہے مگر طوطا بات کو طول دیتا تھا۔ ملکہ بے چین ہوئی جاتی تھی۔ ان دونوں سے نہ رہا گیا، اپنی اصلی صورت میں سامنے آموجود ہوئے۔ اس وقت تینوں کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ طوطا الگ باغ باغ ہوا جاتا تھا۔ سب نے اپنے اپنے قصے سنائے، خوب ہنسے، خوب روئے۔

بادشاہ کو خبر ملی کہ ملکہ کے پاس ایک جوان پری زاد اور ایک حسینہ کی صورت کہیں سے آئے ہیں اور آپس میں ہنس بول رہے ہیں۔ اس نے فوراً سواروں کو حکم دیا کہ پورے باغ کو گھیر لو۔ رات تو اسی طرح گزری۔ صبح کو جان عالم اسم اعظم پڑھتا ہوا باغ کے دروازے پر آیا۔ جس کی نظر پڑی اسم کی برکت سے آداب بجالایا۔ ہر ایک ہاتھ باندھ کے سامنے آیا اور اس نے جان عالم کی اطاعت قبول کی۔

بادشاہ نے یہ سنا کہ فوج اس جوان سے مل گئی تو اور بھاری اور جی توڑ کے لڑنے والی فوج بھیجی۔ اس کا بھی یہ حشر ہوا کہ اطاعت قبول کر لی۔ اب تو وہ آگ بگولہ ہوگیا اور خود ٹکر لینے کو بڑھا۔ جو فوج جان عالم کی اطاعت قبول کر چکی تھی وہ جان عالم کی طرف سے لڑی۔ کچھ سوار زخمی ہوئے۔ بادشاہ کو جان سے تو نہ مارا مگر کمند ڈال کے پکڑا اور جان عالم کے حوالے کر دیا۔

جان عالم نے اس سے کہا ”تم کیسے بادشاہ ہو، مہمان کی خاطر تواضع کرنے کے بجائے اس سے لڑتے ہو۔ خیر تمہاری سلطنت تمہیں مبارک ہو، ہم تو مسافر ہیں آج نہیں تو کل چل دیں گے۔“ بادشاہ جان عالم سے یہ الفاظ سن کے شرمندہ ہوا، معافی چاہی اور خوب خاطر داری کی۔ کچھ دن آرام کرنے کے بعد یہ قافلہ وہاں سے روانہ ہوا۔

وطن کی واپسی

غرض شہزادہ جان عالم سفر کی منزلیں طے کر کے ساتھ خیریت کے اپنے وطن پہنچا۔ شہر سے دو کوس دور اس کا لشکر اترا۔ فصحت آباد کے گلی کوچوں میں یہ خبر گرم ہوگئی کہ کوئی طاقت ور دشمن بھاری لشکر اور جنگ کا ساز و سامان لے کر حملہ آور ہوا ہے۔

شہزادے کی غیر حاضری میں شہر کا یہ حال ہوگیا تھا کہ گلی کوچوں

میں خاک اڑتی تھی، بازاروں میں ویرانی برستی تھی۔ بادشاہ کو سلطنت کے معاملات میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ ہر وقت ایک گوشے میں پڑا اپنے نصیبوں کو کوستا تھا۔ روتے روتے دونوں میاں بیوی آنکھیں کھو بیٹھے تھے۔ سلطنت کے پرانے نمک خوار حکومت کا کاروبار کسی نہ کسی طرح چلا رہے تھے۔

فوج کے اترنے کی خبر سن کر وزیراعظم خود شہر سے باہر آیا۔ دیکھا ایک زبردست لشکر دور تک سمندر کی طرح موجیں مار رہا ہے، خون خرابے کا ڈر ہوا۔ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوا مگر اسے پہچان نہ پایا، بولا ''اس ملک پر پہلے ہی آفت آئی ہے، وہ چراغ نہ رہا جس سے بادشاہ کی آنکھیں روشن تھیں۔ اب تو وہ سچ مچ اندھا ہوگیا ہے۔ اگر تخت وتاج کی خواہش ہے تو وہ حاضر ہے مگر خون خرابے سے ہاتھ اٹھایئے۔''

جان عالم یہ سن کے رو دیا، وزیر کو گلے سے لگا، خلعت دیا اور بولا ''افسوس تم نے اپنی گود کے پالے کو نہ پہچانا۔'' اب جو اس نے غور سے شہزادے کو دیکھا تو پہچان گیا کہ یہ جان عالم ہے۔ بلا اجازت دوڑا اور بادشاہ کو خوش خبری سنائی کہ یہ اجڑا نگر پھر آباد ہوا۔ میاں بیوی نے یہ خوش خبری سنی تو آنکھوں کی روشنی پھر سے لوٹ آئی۔

بادشاہ سوار ہو کے اپنے بیٹے اور بہوؤں کو لینے آیا۔ تینوں نے ادب سے قدم چوما۔ بادشاہ نے بہت سی دعائیں دیں۔ ساری رعایا استقبال کو امڈ پڑی۔ یہ قافلہ وہاں سے محل کے لیے روانہ ہوا۔ سارے راستے منوں سونا اور چاندی ان کے سروں پر سے نثار کیے گئے۔ جان عالم کی ماں نے انجمن آرا اور ملکہ مہر نگار کو دیکھا، دونوں پر جان و دل نثار کیا۔ چاروں طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں آنے لگیں۔

انجمن آرا اور مہر نگار ماہ طلعت سے ملنے کو بے تاب تھیں۔ بادشاہ نے منع کیا کہ وہ بہت مغرور اور منہ پھٹ ہے مگر انہیں ملاقات کا بڑا اشتیاق تھا۔ اس لیے اس نے اجازت دے دی۔ ماہ طلعت شرمندہ ہوئی مگر دروازے تک استقبال کو آئی۔ طوطے نے ماہ طلعت کو جلی کٹی سنائیں۔ بولا ''شہزادی صاحبہ! اب بتاؤ سچا کون اور جھوٹا کون؟'' انجمن آرا نے طوطے کو ڈانٹا، ملکہ نے اپنی میٹھی زبان سے ماہ طلعت کا دل موہ لیا، بولی ''ہمارے بارے میں کچھ اور خیال نہ کرنا، ہم تو ہر طرح تمہارے دکھ سکھ کے ساتھ ہیں۔'' غرض یہ کہ جلدی ہی تینوں آپس میں گھل مل گئیں۔

اجڑا ہوا شہر پھر سے بسا، جہاں ماتم ہوتا تھا وہاں خوشیوں کے شادیانے بجنے لگے۔ جان عالم نے ساری رعایا کو شہر پناہ کے دروازے پر بلایا اور انہیں وہ بکری کا بچہ دکھایا جس کے جسم میں وزیر زادے کی روح قید تھی، گھر میں اس کی نمک حرامیوں کی داستان سنائی۔ سب نے اس پر لعنت بھیجی۔ آخر جلاد نے اس کا عضو عضو الگ کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیا۔ اسی روز فیروز بخت نے تاج وتخت بیٹے کو سونپا اور خود یادِ خدا میں مشغول ہوا۔

جان عالم نے ایسے انصاف سے کام لیا اور اتنی سخاوت دکھائی کہ رہتی دنیا تک اس کا نام روشن رہے گا۔ جس طرح جان عالم اپنے مقصد میں کامیاب ہوا خدا سب کو اسی طرح کامیاب کرے اور جیسے اس کی مرادیں پوری کیں، اسی طرح سب کی مرادیں پوری کرے۔ ختم شد□

▲ڈرائنگ: الصبا لیاقت بخشی، کلاس vi، آئیڈیل اردو ہائی اسکول شولا پور مہاراشٹر

ماں کا آنچل

ماں کا آنچل دھوپ میں بادل
ماں کی بانہیں نیند کی راہیں
ماں کا دامن ہنستا ساون
ماں کا غصہ پیار کا حصہ
ماں کی دعا جنت کی ہوا

درخشاں نگار، کلاس viii، شاہین باغ، نئی دہلی۔110025

■ شہید اعظم بھگت سنگھ کا یہ اسکیچ نبیلہ مہوش نے بنایا ہے جن کا خط اور تصویر دیکھیں 'اردو فیس بک' پر

▲ڈرائنگ: تحسین ناز شیخ، کلاس iv انگلش پرائمری اسکول آزاد نگر دھولیا مہاراشٹر

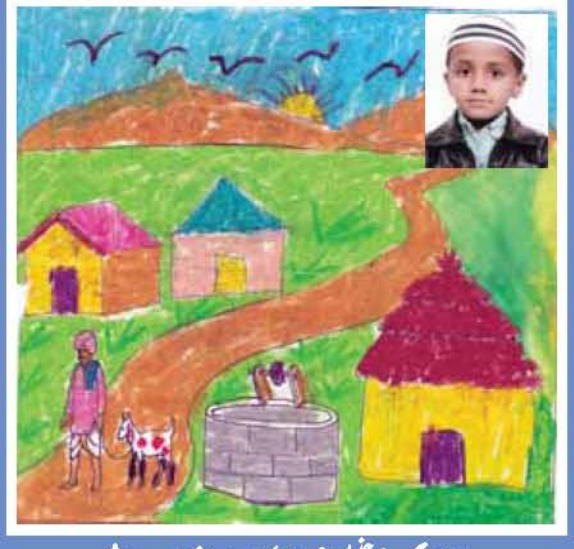

▲ڈرائنگ: محمد حنبل انصاری کلاس i، مالیگاؤں مہاراشٹر

اردو Facebook

□ میں قدسیہ عتیق احمد درجہ پانچویں میں پڑھتی ہوں۔ نانا کے گھر 'بچوں کی دنیا' دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ پورا رسالہ چھان ڈالا۔ کہانیاں، نظمیں، کامکس، لطیفے، اسی دن کا سفر، نانی کی ناؤ چلی، یہ نظم مجھے بہت پسند آئی۔ اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر آپ لوگوں کو مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

قدسیہ عتیق احمد سویس ہائی اسکول مالیگاؤں، ناسک

□ ہر چند کہ میں Kendriya Vidyalaya (AFS) کلاس چھٹی کی طالبہ ہوں جہاں اردو کا کوئی شعبہ نہیں ہے لیکن میرے ابو جناب احمد وکیل علیمی اردو میڈیم اسکول کے معلم ہیں اور وہ مجھے اردو پڑھا رہے ہیں۔ بچوں کے لیے کئی رسالے امنگ، ستارے، گلشن اطفال، بچوں کا تحفہ، وغیرہ میرے گھر پر آتے ہیں۔ لیکن 'بچوں کی دنیا' سب سے الگ اور Atracrtive ہے۔ میں مکمل Interest کے ساتھ رسالہ پڑھتی ہوں اور 'بچوں کی دنیا' مجھے بھا گیا ہے۔

نبیلہ مہوش، کیندریہ ودیالیہ بیرک پور کانکی نارا، کولکاتہ، مغربی بنگال

□ مدیر انکل میرا نام فیصل ملک محمد اسرائیل ہے۔ ہر ماہ میرے پاپا پابندی سے مجھے 'بچوں کی دنیا' لاکر دیتے ہیں میں اسے شوق سے پڑھتا ہوں۔ کہانیاں، نظمیں، کامکس، لطیفے، آپ کے سوال ڈاکٹر بقراط کے جواب کا سلسلہ، جو تصویروں کے ساتھ دیا جاتا تھا بہت اچھے لگتے ہیں۔ تمام قلمکاروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

فیصل ملک محمد اسرائیل پرائمری اسکول۔ مالیگاؤں، ناسک

□ پہلی نظر میں 'بچوں کی دنیا' کا فین ہوگیا۔ ہر ماہ بے صبری سے اس کا انتظار رہتا ہے۔ یہ ماہ نامہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ اسے بچے ہی نہیں بلکہ نوجوان اور بوڑھے بھی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ سبق آموز کہانیاں لطیفے، مذہبی معلومات، تاریخی معلومات، کامکس نظمیں پڑھ کر دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ آخر میں دعا گو ہوں کہ 'بچوں کی دنیا' برابر ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے۔

حذیفہ محمد اسرائیل ہائی اسکول، مالیگاؤں، ناسک

□ طوبیٰ شفیق احمد میونسپل اردو اسکول نمبر 75 کی طالبہ ہوں۔ درجہ ساتویں میں پڑھتی ہوں۔ مجھے اردو سے رغبت ہے۔ میرے ماموں ہر ماہ پابندی سے ''بچوں کی دنیا'' لاکر دیتے ہیں۔ جس کو دل لگا کر پڑھتی ہوں۔ مجھے نیکیوں کے مٹکے کہانی بہت پسند آئی۔ اسی طرح نظمیں، لطیفے، کامکس، اور بہت ساری جو ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ اگر کوئی انعامی مقابلہ بھی شروع کردیا جائے تو بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اس امید کے ساتھ کہ اس پر نظر ثانی ہوگی۔

طوبیٰ شفیق احمد مالیگاؤں، ناسک

□ 'بچوں کی دنیا' کا شمارہ پسند آیا۔ تصویریں ماشا اللہ بڑی جاندار اور شاندار ہیں۔ کارٹون بھی لاجواب ہے۔ ایک ایک حرف محنت اور محبت سے سجا سنوار کر لکھا ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

ثمن فاطمہ رومی، رومی منزل، پھول باغ، آمبور ضلع ویلور، تمل ناڈو

برادرِ مشفق مدیر اعزازی، میں بتا نہیں سکتا کہ 'بچوں کی دنیا' کے لیے میں آپ کے حکم کی تعمیل نہ کرپانے کے سبب اپنے آپ سے کتنا شرمندہ رہا ہوں۔ اگر اپنے چاہنے والے کی خواہش کا احترام نہ کیا جاسکے تو چاہے جانے والے پر تف ہے۔ بہرحال! خود پر اس زجر و توبیخ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے میری پرانی فائل میں اپنی لکھی پہلی کہانی دستیاب ہوگئی۔ یہ کہانی 55 سال پہلے لکھی گئی، یعنی دس سال کی عمر میں میں۔ اصل کہانی کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ اسی کے ساتھ اسے تازہ بتازہ لکھ کر بھی بھیج رہا ہوں۔ دونوں مسودات کے املا جملہ اور بیانیہ کے درمیان فطری طور پر کچھ فرق آن پڑا ہے، جسے آنا ہی تھا۔ اس نومبر میں 65 سال مکمل ہونے پر میں ملازمت سے سبک دوش ہو رہا ہوں۔ اگر یہ کہانی اس اطلاع کے ساتھ نومبر کے شمارے میں شائع ہوجائے تو اس بوڑھے کو خوش ہونے کا تھوڑا سا بہانہ مل جائے گا۔ فقط والسلام

حسین الحق، سرسید کالونی، نیو کریم گنج، گیا، بہار

مدیر محترم، 'بچوں کی دنیا' ایک مکمل کارآمد اور مفید فیملی میگزین ہے۔ اس کی اشاعت پر بچوں سے زیادہ مجھ کو خوشی حاصل ہوئی ہے۔ ایک بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں شاید کسی نے نہ کہی ہو وہ یہ کہ آپ جدت پسند بچوں کی نفسیات کے ماہر اور ادب اطفال کے اسکالر ہیں۔ آپ کی جدت پسندی کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ فسانۂ عجائب کی تصویروں سے بھی طلسم جھلکتا ہے اور آپ نے ایک جانور کو ہنستا ہوا دکھایا۔ یہ آپ کی جدت پسندی کا عروج ہے۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں کچھ جدید تصویروں کے اشارے بھیج رہا ہوں جن کا تعلق کہانیوں اور محاوروں سے ہے تصویریں بذاتِ خود تحریری ہیں۔ آپ کا کمپوزر یا آرٹسٹ اسے بخوبی بنا سکتا ہے۔ مثلاً: ♦ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ ندی کنارے شیر اور بکری بیٹھے ہیں۔ شیر کے ہاتھ میں گلاس ہے، وہ بکری کو پانی پلا رہا ہے۔ ♦ شیر اور چوہا۔ پنجرے میں چوہا بند ہے، شیر پنجرے کا دروازہ کھول رہا ہے۔ ♦ لومڑی اور سارس۔ لومڑی سارس کو جھولا جھلا رہی ہے۔ ♦ پیاسا کوا۔ مٹکے پر کوا بیٹھا ہے وہ ٹلکی سے پانی پی رہا ہے۔ ♦ نیولا اور سانپ۔ سانپ کے آگے نیولا بین بجا رلا ہے۔ ♦ مرغی کا بچہ۔ مرغی اپنے بچوں کے ساتھ کھڑی ہے، ایک چیل پنجوں میں چوزہ دبائے آتی ہے اور کہتی ہے ''لو سنبھالو اپنے بچے کو بہت دور دور گھومنے جاتا ہے۔'' ♦ بندر اور مگرمچھ۔ دریا کے کنارے مگرمچھ ہے درخت سے اتر کر بندر اسے اپنا دل دیتا ہے۔ ♦ بندر کا گھر۔ بندر اپنا گھر بنا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہتھوڑی اور کیل ہے آس پاس اوزار اور لکڑی رکھے ہیں۔ ♦ صحرا کا جہاز۔ صحرا میں جہاز چل رہا ہے۔ جس کی شکل اونٹ جیسی ہے۔ ♦ کوا اور کویل۔ کوا کہتا ہے ''بہن کوئل تمہارے انڈوں میں سے بچے نکل آئے انھیں لے جاؤ۔'' ♦ بھینس کے آگے بین بجانا۔ بھینس بیٹھی بین بجا رہی ہے۔ ♦ بلّی اور چوہا۔ بلّی چوہے کے گلے میں گھنٹی باندھ رہی ہے۔ ♦ سارس اور لومڑی۔ لومڑی منہ کھول کر بیٹھی ہے سارس اس کے منہ میں مچھلی ڈال رہا ہے۔ ♦ دھوبی اور گدھا۔ دھوبی اپنے گدھے کو طشتری میں کھانا کھلا رہا ہے۔ ♦ آنبل مجھے مار۔ کسان کہتا ہے ''جانبل اُسے

مار۔" ♦ یکے والا۔ یکہ میں گھوڑا بیٹھا ہے۔ یکے والا تانگہ کھینچ رہا ہے۔ ♦ کتیا اور بلی۔ ایک کتیا بلی کے بچوں کو دودھ پلا رہی ہے۔ ♦ کچھوا اور خرگوش۔ کچھوا جا رہا ہے خرگوش درخت کی آڑ میں چھپا ہے۔ آپ مزید کہانیوں اور محاوروں کو اسی طرح پیش کر سکتے ہیں۔

محمد یوسف انصاری، 368 نیو وارڈ، مالیگاؤں، مہاراشٹر

♦ مزید ارمشورے بھیجنے کا شکریہ۔ کیا ہی اچھا ہو جو آپ اور دیگر محترم قلم کار اسی طرح کے موضوعات پر کہانیاں لکھ کر ہمیں بھیجیں۔ اعزازی مدیر

'بچوں کی دنیا' پڑھتی تو عرصے سے ہوں۔ لیکن خط، آج پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی بات شروع کروں 'بچوں کی دنیا' اور اس کے تمام ذمہ داران کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔ کہ اس طرح کا خوب صورت رسالہ شائع کر کے انھوں نے نہ صرف بچوں کی بلکہ بڑوں کی زندگی میں بھی جیسے خوش رنگ بھر دیے ہیں۔ رسالے کا سرِ ورق دیکھ کر ہی اس پر دل فدا ہو جاتا ہے۔ آپ یقین جانیں جب بھی میرے ٹیبل پر ایک طرف نصاب کی کتاب اور دوسری طرف 'بچوں کی دنیا' ہوتی ہے تو میں پہلے ترجیح 'بچوں کی دنیا' کو دیتی ہوں۔ کیا کروں؟ یہ رسالہ ہے ہی بہترین! اور یہ بات میں محض خط کی طوالت کے لیے نہیں کہہ رہی ہوں۔ یقیناً میں نے اتنا زبردست اور تمام رنگینیوں سے بھرا رسالہ نہیں دیکھا۔ آپ نے غالب کا وہ شعر تو سنا ہی ہوگا۔

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مجھے بے انتہا حیرانی ہوتی ہے کہ آپ بچوں کی دنیا میں جب بھی کوئی نظم، کہانی، مضمون وغیرہ شائع کرتے ہیں تو ہر پیراگراف اور ہر لائن سے متعلق تصویر بھی شائع ہوتی ہے اور اگر میں غلط نہیں ہوں تو آپ کے لیے ہر کہانی، نظم یا مضامین وغیرہ کو پڑھ کر ان سے متعلق تصاویر ڈھونڈنا سب سے زیادہ مشکل کام ہوتا ہوگا اور آپ یہی اسے بخوبی نبھاتے بھی ہیں۔ ویسے یہ تو رسالے کی بات تھی میں اپنے تعلق سے بھی کچھ بتا دوں۔ میں اپنے پیارے وطن ہندوستان کے تاریخی شہر اورنگ آباد سے یہ خط تحریر کر رہی ہوں۔ مشہور ڈرامہ نگار، شکسپئر نے کہا ہے کہ "نام میں کیا رکھا ہے؟" خیر! یہ ان کی اپنی بات تھی، مگر میں کہتی ہوں کہ نام سے انسان کو جانا جاتا ہے اور کام سے اس کی پہچان ہوتی ہے۔ تو انسان کو جاننے اور پہچاننے کے لیے 'نام' اور 'کام' دونوں ہی ضروری ہیں۔ میرا نام صبا منیر ہے، اور میں مولانا آزاد کالج ڈاکٹر رفیق ذکریہ کیمپس میں BSc سیکنڈ ایئر میں زیر تعلیم ہوں۔ اپنے تعلق سے بتانے کے لیے میرے پاس شاید کچھ دلچسپ نہیں ہے مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ 'بچوں کی دنیا' کا یہ شاندار سلسلہ جاری رکھیں۔ اس کی کامیابی محض آپ کی یا قارئین کی کامیابی نہیں بلکہ 'اردو' کی بھی کامیابی ہوگی۔

صبا منیر، مولانا آزاد کالج روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر ▫

بچوں کی دنیا

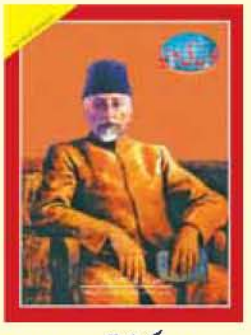

دیکھو یہ بچوں کی دنیا
بچوں کے سپنوں کی دنیا
قصے اور کہانی اس میں
باتیں نئی، پرانی اس میں
نظمیں بھی ہیں پیاری پیاری
بچوں کو جو لگتیں اچھی
نانی کا ہے خوب پٹارا
بچوں کے ہے سامنے سارا
بچے اس سے نالج پائیں
اپنی معلومات بڑھائیں
ایس ایم ایس بھی ان کو بھائیں
بچے ان سے دل بہلائیں
کہنی ہے گر اپنی بات
خط سے بھیجو یہ سوغات
بچے، بوڑھے اور جوان
رہتے اس پر سب قربان
سارے اس کو شوق سے پڑھتے
پڑھتے پڑھتے آگے بڑھتے
دیکھ لے اس کو جو اک بار
ہو جاتا ہے اس پہ نثار
اردو کا ہے یہ گلدستہ
چاہے اس کو بچہ بچہ
دہلی سے ہر ماہ نکل کر
آ جاتا ہے یہ گھر گھر
سب ہی کچھ ہے اس کے اندر
گویا ہے کوزے میں سمندر

بشکریہ
جناب رضا الرحمٰن عاکف سنبھلی